دربھنگا
تمثیلِ نو
سہ ماہی
صاف کرکے آئینے کی گرد کو
ڈھونڈ کر لاؤ کوئی تمثیلِ نو
ایڈیٹر
ڈاکٹر امام اعظم
RS. 75/-
Meer Zaheer Abass Rustmani

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

تمثیلِ نو ایک معتبر جریدہ

۹۸۰ + ۵۶ + ۳۱ + ۷۱۲ + ۲۲۲ = ۲۰۰۱ء

جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان

سہ ماہی ''تمثیل نو'' در بھنگا

جلد:۱ | جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء | شمارہ:۴

زر تعاون

فی شمارہ: ۱۵ روپے۔ سالانہ: ۶۰ روپے۔ خصوصی تعاون: ۳۰۰ روپے۔ تاحیات (بھارت): ۳۰۰۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش (سالانہ): ۲۰۰ روپے۔ دیگر ممالک (سالانہ): ۱۵ امریکی ڈالر

رابطہ: ''تمثیلِ نو'' قلعہ گھاٹ، دربھنگا۔ ۸۴۶۰۰۴ (بہار)۔ فون: ۳۵۱۱۷-۰۶۲۷۲

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر و آنر ڈاکٹر امام اعظم نے دربھنگا آفسیٹ پرنٹرس، دربھنگا سے چھپواکر دفتر ''تمثیل نو'' اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگا۔۴ سے شائع کیا

کمپوزنگ: اقرا گرافکس اینڈ انسٹی چیوٹ، دربھنگہ

ترتیب

مجھے کچھ کہنا ہے......!

اکیڈمک اسٹاف کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں اردو ریفریشر کورس کے سلسلہ میں مجھے تقریباً ایک ماہ تک رہنے کا اتفاق ہوا۔ حسن اتفاق کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس کے موقعہ سے تمثیلی مشاعرہ، ادبی سیمینار، نیز قومی کونسل برائے فروغ اردو کی جانب سے دوسرے کل ہند کتاب میلہ (۳ر نومبر تا ۱۱ر نومبر ۲۰۰۱ء) کا انعقاد بھی ہوا جسے دیکھنے اور استفادہ کا موقعہ ملا۔ کتاب تہذیب وثقافت کی امین ہوتی ہے اس کے ذریعہ ماضی کے ورثے کو مستقبل کے لوگوں تک پہنچا کر کامیابی کی راہیں متعین کی جاتی ہیں۔ انسانی تاریخ کے ہر عہد میں کتابوں کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔

فارسی ریفریشر کورس کی الوداعیہ تقریب کے موقعہ پر اکیڈمک اسٹاف کالج کی جانب سے ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت محترمہ نکہت مقبول مہدی صاحبہ (اہلیہ ڈاکٹر شاہد مہدی، وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انہوں نے ''اردو مشاعروں کو ہندوستانی تہذیب کی خوبصورت منہ بولتی مثال سے تعبیر کیا'' اس مشاعرہ کی شروعات مہمان خصوصی محترمہ ڈاکٹر شیمہ رضوی (وزیر صحت، حکومت اتر پردیش) جو مذکورہ ریفریشر کورس میں شامل تھیں کی تقریر سے ہوئی۔ انہوں نے فرمایا ''اردو کو اسی وقت کوئی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے جب ہم اس زبان کے تئیں احساس کمتری کے شکار ہوجائیں اردو ہماری شناخت ہے۔ تہذیب کی زبان ہے اور ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ ہر زبان پر اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ آج وہ لوگ بھی اردو کی عظمت وشیرینی کا اعتراف کرتے ہیں جو اردو نہیں جانتے'' اس مشاعرہ کی نظامت پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کے شعبہ اردو سے وابستہ ڈاکٹر ناشر نقوی نے کی جو اس کورس میں شریک تھے دہلی کے قیام کے دوران ساختیات اور مابعد جدیدیت کے نظریہ ساز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ اور بہت سی دوسری اہم شخصیات سے بھی گفتگو اور استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔

موجودہ صورت حال میں دہشت گردی کے عنوان سے مختلف النوع خیالات سامنے آرہے ہیں۔ ادبی حلقے بھی اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ یہاں بھی دہشت گردی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن معاملہ دہشت گردی کی واضح تعریف سے تعلق رکھتا ہے۔ راحت اندوری کا شعر ہے ؂

وہ پاؤں ہی سے نہیں ذہن سے اپاہج ہے ۔۔۔ اُدھر چلیں گے جدھر رہنما چلاتا ہے

ادبی رسالوں کے نکلنے کا سلسلہ کم وبیش چلتا رہا ہے مگر یہ سفر دشوار تر ہے اور سنگلاخ بھی ادبی کارناموں کی تشہیر دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ آج کل آسان ہے لیکن پرنٹ میڈیا کے ذریعہ کسی ادب پارے یا ادبی تخلیقات کو پیش کرنا اور ادب نوازوں کے درمیان پھیلانا بڑا ہی مشکل اور دشوار کام ہے۔ اس وقت ادب میں معیار کا تعین کرنا اور کسی مدیر کے لئے یہ طے کرنا بھی مشکل ہے کہ وہ کس طرح کی تخلیق کو اپنے رسالے میں جگہ دے کیونکہ کسی رسالہ کا معیار طے کرنا تو ادب نوازوں، ادبی تحریک چلانے والوں اور ادبی رجحانات کا تعین کرنے والوں کا کام ہے۔ مدیر کا کام صرف مزاج کے نوک پلک کے اعتبار سے کسی تخلیق کو شریک اشاعت کرنا ہوتا ہے۔ جس عہد میں یہ رسالہ نکل رہا ہے اس میں مختلف نظریات رجحانات اور تحریکات کا ملا جلا عکس ضرور نظر آتا ہے اور اسے خالص ادبی کرنے کی کوشش ایک طرح کی نئی تحریک یا میلان کو بڑھاوا دینا ہوتا ہے۔ مگر ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ تحریکات اپنی مدت تک اچھی لگتی ہیں میلانات ایک خاص طبقے اور نظریے تک پسند کئے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک بڑا ادبی کام جسے منظر عام پر آنا چاہیے نہیں آسکتا۔ اس لئے اس طرح کا Free Axis ہم نے ''تمثیل نو'' کے لئے چھوڑ رکھا ہے تاکہ ادیب و فنکار آزادانہ طور پر بغیر کسی لیبل کے تخلیقات پیش کرتے رہیں۔ یہی ہمارا مقصد اور یہی ہماری خدمت ہے جس کا واضح ثبوت ''تمثیل نو'' کے گذشتہ شمارے ہیں اور زیر مطالعہ شمارہ بھی ہے۔ ادارہ ''تمثیل نو'' اپنے تمام قارئین کی خدمت میں سال نو کی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

وفیات:

نئی صدی کے شروع ہوتے ہی ہمارے درمیان سے کئی ادبی شخصیتیں جدا ہو گئیں۔ ہم نے ادبی حضرات کے انتقال پر ملال پر استاد گرامی پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی صاحب سے تاریخ وفات کہلوانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ امید کہ ''تمثیل نو'' کی یہ انفرادیت پسند کی جائیگی۔

☆ انور خان کا انتقال ۴ر ستمبر کو ممبئی میں ہوگیا۔ یہ ایک معروف افسانہ نگار اور ادیب تھے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''راستے اور کھڑکیاں''، ''فنکاری''، ''یاد بسیرے'' اور ایک ناول ''پھول جیسے اہم لوگ'' شائع ہو چکے ہیں۔

☆ شعیب شمس (شاہ محمد شعیب) معروف افسانہ نگار، شاعر اور ادیب تھے۔ ان کا انتقال یکم نومبر ۲۰۰۱ کو پورٹ بلیئر میں ہوگیا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے اور ایک طویل نظم کے

علاوہ تنقیدی کتاب ''شکیل الرحمٰن: ایک لیجینڈ'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انہوں نے پورٹ بلیئر سے ''جزیرہ'' کے نام سے رسالہ بھی نکالا تھا۔

☆ شہود عالم آفاقی ایک معروف شاعر اور صحافی تھے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ماہنامہ ''شہود'' کولکاتہ سے نکالتے تھے۔ ان کا انتقال ۸رنومبر ۲۰۰۱ء کو کولکاتہ میں ہوا۔

☆ انجینئر محمد نورالاسلام نشتر کا انتقال ۱۱رنومبر ۲۰۰۱ء کو در بھنگا میں ہوا۔ وہ کئی سال سے بیمار تھے پھر بھی عزم وحوصلہ جواں تھا۔ بڑے ہی مخلص انسان تھے۔ انتقال سے چند ماہ قبل ان کی ایک تنقیدی کتاب ''سیال لہریں'' منظر عام پر آ گئی تھی اور ''تثلیث''، ''لمس معنی'' (شعری مجموعہ) زیر اشاعت ہیں۔

☆ ادریس دہلوی ایک معروف صحافی تھے۔ ان کا انتقال ۲۰رنومبر کو دہلی میں ہو گیا۔ ان کی ادارت میں ''آئینہ''، ''شمع''، ''بانو''، ''مجرم''، ''شبستان''، ''کھلونا'' اور ''سشما'' (ہندی) بڑی آب وتاب سے نکلے۔ اردو صحافت میں ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔ اللہ سے دعاء ہے کہ ان حضرات کی روح کو تسکین دے اور انہیں جنت نصیب کرے۔ آمین

☆ ہر چرن چاولہ ایک بڑے فکشن نگار اور دانشور تھے۔ ان کا انتقال ۶ ردسمبر کو اوسلو (ناروے) میں ہو گیا۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

☆ طنز وظرافت کی دنیا کے ممتاز ترین شاعر رضا نقوی واہی کا انتقال ۵رجنوری ۲۰۰۲ء کو پٹنہ میں ہو گیا۔ مرحوم جتنے بڑے فنکار تھے اس سے بڑھ کر ایک مخلص انسان بھی تھے۔ ان کے مزاج میں بلا کی سادگی تھی۔ ان کے وصال سے طنز وظرافت کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

انعامات واعزازات:

☆ عالم اسلام کی ممتاز شخصیت حضرت قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کو انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹو اسٹڈیز کی جانب سے ''شاہ ولی اللہ ایوارڈ'' دیا گیا۔

☆ اردو کے معروف افسانہ نگار غیر مسعود کو ان کے افسانوی مجموعہ ''طاؤس چمن کی مینا'' پر ۲۰۰۱ء کا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا ہے۔

☆ اردو کے معروف نقاد، دانشور اور ''مباحثہ'' کے مدیر پروفیسر وہاب اشرفی کو غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی نے ۲۰۰۱ء کا غالب ایوارڈ برائے نثر دینے کا اعلان کیا ہے۔

☆ معروف دانشور، ماہر جغرافیہ اور ال ان متھلا یونیورسٹی دربھنگہ (بہار) کے فعال اور متحرک وائس چانسلر پروفیسر بالیشور ٹھاکر کو نیشنل ایسوسی ایشن آف جغرافرز انڈیا (ناگی) کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ ادارہ ''تمثیل نو'' دل کی گہرائیوں سے ان تمام حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

☆ ہندی کی معروف ادبی وثقافتی انجمن ''ساہتیہ کارسند'' سمستی پور ہر سال ہندی، اردو، میتھلی اور بجیکا کی کتابوں پر انعام دیتی ہے۔ اس بار پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی کی وقیع کتاب ''رفتگاں اور قائماں'' (دربھنگہ کی منظوم ادبی تاریخ) پر ''قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ''، پروفیسر سید منظر امام مدیر ''وقت'' دھنباد کو برائے صحافت ''خشونت سنگھ راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' اقبال انصاری کو ان کے ناول ''آخری پٹھان'' پر ''پروفیسر شکیل الرحمن راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ''، عشرت رومانی کو ان کے شعری مجموعہ ''صبح آنے کو ہے'' پر ''ساحر لدھیانوی راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' پروفیسر اظہر قادری کو ان کی تنقیدی کتاب ''فکر وفن کے محرکات'' پر ''خواجہ احمد عباس راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' حامد علی سید کو ان کے شعری مجموعہ ''ابھرتا ڈوبتا سورج'' پر ''فراق گورکھپوری راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' پروفیسر نادم بلخی کو ان کی کتاب ''دلچسپ کہانی ان کی'' پر ''شاد عظیم آبادی راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' غلام مرتضٰی راہی کی کتاب ''لاکلام'' پر ''فیض احمد فیض راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' ڈاکٹر اسلام عشرت کی وقیع کتاب ''جاں نثار اختر شاعر جدید'' پر ''ڈاکٹر عنوان چشتی راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' ڈاکٹر شمس تبریز خاں کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی: ناقد اور محقق'' پر ''مولانا آزاد راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' ڈاکٹر نیر حسن نیر کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی بحیثیت شاعر'' پر ''قاضی عبدالودود راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' اور شان بھارتی مدیر ''رنگ'' کو ان کے شعری مجموعہ ''آخری صلیب'' پر ''جوش ملیح آبادی راشٹریہ شکھر ساہتیہ ایوارڈ'' دینے کا اعلان کیا ہے ساہتیہ کارسند کے چیئرمین ہندی کے معروف نقاد، شاعر اور مجاہد آزادی ڈاکٹر ہری ونش ترون کو اور انعام یافتگان حضرات کو ادارہ ''تمثیل نو'' مبارکباد پیش کرتا ہے!۔

——— امام اعظم

پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزیؔ

قطعاتِ تاریخ بروفات مشاہیر ادب

انور خان، ممبئی

وہ بھی پائیں گھر جنت میں ایک بفضل رحماں — ذات سے جن کی آئے ادب میں افسانوں کے ایواں
اچھے اک فنکار بھی وہ تھے نیک شریف اک انساں — انور خاں کی موت ہے لائی افسانوں کا نقصاں

۲۰۰۱ء

شعیب شمسؔ، موتیہاری

آئے ابھی، رکے بھی نہیں اور چل دیئے — قید غم حیات سے جاں بر نہ ہو سکے
سالِ وفات ان کا یہ مصرعہ بتائے گا — کہہ اَب شعیب شمس بھی جنت مکیں ہوئے

۱۴۲۲ھ

شہود عالم آفاقی، کولکاتہ

ممتاز و منفرد تھے غزل کی کتاب میں — فنکار ایک عظیم تھے شعری نصاب میں
''اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے'' — آجائیں وہ شہود بھی خیرالحساب میں

۱۴۲۲ھ

محمد نورالاسلام نشترؔ، دربھنگا

''کوئے غزل'' میں ماتم برپا — لے آئے تابوت میں رکھ کر
ہستی کا انجام یہی ہے — خاک ہے نیچے خاک ہے اوپر
دنیا سے عقبیٰ ہی بھلی ہے — اب ہے جا فردوس میں نشترؔ

۱۴۲۲ھ

ادریس دہلوی

فن کار ایسے کتنے ہیں گذرے تو دامن خالی تھا — مجبوریٔ حالات نے روکا جو شاید راستہ
اچھا کہو ادریس کو اچھا ادب وہ دے گیا — مجرم' کھلونا' بانوؔ' اب یا شمع' ششما' آئینہ

۲۰۰۱ء

ہرچرن سنگھ چاولہ، ناروے

واقف اسرارِ فن تھا اک ہمارے درمیاں — کون بتلائے بسائی آپ نے بستی کہاں
ہرچرن وہ چاولہ تھے خادمِ اردو زباں — عظمتِ افسانۂ اردو کی کہئے پاسباں

۲۰۰۱ء

رضا نقوی واہیؔ، پٹنہ

تھے فن کار ماہر گئے وہ بھی آخر
رضا نقوی واہی بڑے اک جو شاعر

۲۰۰۲ء

شعیب شمس

ایک گفتگو شکیل الرحمٰن سے!

سوال: تنقید اور اردو تنقید کے موضوع پر آپ کے خیالات جاننا چاہتا ہوں، کیا آپ اردو تنقید کے سفر سے مطمئن ہیں؟

جواب: اردو تنقید جنم لیتے ہی مغربی تنقید کے کمبل میں جا گھسی وہ کمبل چھوڑنے کو تیار ہے اور نہ کمبل اسے چھوڑ رہا ہے۔ تصورات نظریات اور خیالات کی بھیک حاصل کرنے کا سلسلہ اب تک جاری ہے حالت یہ ہے کہ اردو کا ناقد بعض پٹے پٹائے مغربی خیالات نظریات اور تصورات کی بنا پر ادبیات کا پروہت پیشوا یا یہ کہئے Priest بن گیا ہے اور اسے ''پروہت'' تصور بھی کیا جانے لگا ہے جو بڑی بدنصیبی ہے۔

سوال: نقاد کی ذات اور شخصیت کے حوالے سے یہ بتائیے کہ بنیادی خامیاں کیا ہیں؟

جواب: ایک بات ہو تو کوئی بتائے'' پہلی بات تو یہی ہے کہ خیالات ونظریات کی بھیک حاصل کرنے کا سلسلہ موجود ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اردو کا ناقد پروہت یا Priest بن گیا ہے جو اس کا منصب نہیں ہے۔ ایک نفسیاتی سبب یہ اردو کا ناقد ابتداء سے اپنی 'انا' یا 'ایغو' (ego) کا شکار ہے اور اس کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ آج تو اور بھی زیادہ کر رہا ہے۔ ہیں کتنے تنقید لکھنے والے گنتی کے چند ہی لوگ ہیں کہ جن کی بعض تحریروں پر کبھی کبھی نظر ٹھہر جاتی ہے۔ معاف کیجئے گا میں تمام تنقیدی مضامین لکھنے والوں کو نقاد تصور نہیں کرتا، تنقید ایک تخلیقی عمل ہے اور یہ سب کاروباری مضامین لکھنے والے ہیں، میں نے کہا ہے کہ اردو کے نقاد شروع سے اپنی 'انا' یا 'ایغو' کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے شعبوں میں اس 'انا' کی پرورش ہوتی ہے۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر 'ایغو' کا مظاہرہ جاری ہے، اس سے کوئی فائدہ ضرور ہوا ہوگا لیکن نقصان زیادہ ہوا ہے، دیکھ رکھا ابھی بھی وہیں ہو رہی ہے اور غلط باتیں کہنے اور بے ایمانیوں اور ناانصافیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

سوال: ان دنوں 'نظریے' کا ذکر بہت زیادہ ہے پہلے بھی اس پر بات ہوتی رہی ہے لیکن آج زیادہ ہو رہی ہے کوئی حالی کے بعد 'نظریے' کا سب سے بڑا نقاد ہے۔

جواب: (ہنستے ہوئے) اور کوئی ارسطو کے بعد! میں نے کہا تھا کہ اردو تنقید میں بقراط بہت پیدا ہوئے ایک سقراط پیدا نہ ہو سکا، اس 'بقراتی' سے قاری کا ذہن بہت پریشان رہا ہے اور اب بھی ہے۔ ادبی تنقید کا قاری پروہتوں کی باتیں بہت غور سے سنتا اور پڑھتا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن مطمئن نظر نہیں آتا۔

سوال: اور صرف یہی نہیں بلکہ نظریوں کے پیشِ نظر بار بار ایک ہی بات کے دہراتے رہنے سے اب قاری کو اُبکائیاں سی آنے لگی ہیں۔

جواب: میں 'نظریے' کا مخالف نہیں ہوں، ناقد کا وژن، بنتا ہے تو اس میں کئی نظریوں کی روشنی شامل رہتی ہے، کوئی بھی ایک نظریہ فنون کی روح میں اتر نہیں سکتا اور ان کی جمالیات کو سمجھ نہیں سکتا ناقد ایک ساتھ کئی نظریوں کی روشنی حاصل کر سکتا ہے اور کرتا ہے لیکن اسی حد تک کہ اس کے جمالیاتی 'وژن' میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو۔ اور تنقید کا عالم یہ ہے کہ ہر تنقید لکھنے والا اپنے لئے ایک ''نظریہ'' پیدا کرنے کی کوشش میں ہے، یہ نظریہ نظریہ ہی رہتا ہے 'وژن' میں گہرائی اور وسعت پیدا نہیں کرتا۔ آج کچھ تنقید لکھنے والوں نے ضروری جانا کہ ان کے سر پر کسی نظریے کی ٹوکری ضرور ہو۔ سر پر نظریے کی ٹوکری نہ ہوئی تو ان کی پہچان نہیں ہوگی۔ نظریہ برائے نظریہ ہی یہ لوگ عملی تنقید عام طور پر کرتے نہیں اور جب کرتے ہیں تو ان کا نظریہ کہیں اور رہتا ہے اور وہ کہیں اور عملی تنقید میں یہ نظریے والے ناقد چت پٹا نگ ہو جاتے ہیں، چند ناقد ایسے ہیں جو نظریے کی ٹوکری سر پر رکھے چلے لیکن اب تک کچھ دیا نہیں چند ایسے ہیں جنہوں نے اپنی ٹوکری تو تیار کر لی لیکن اٹھا نہ پا رہے ہیں انتظار کر رہے ہیں کوئی آئے تو ٹوکری کے ساتھ انہیں بھی اٹھالے آپ دیکھ رہے ہوں گے رسالوں میں ایسے مضامین چھپ رہے ہیں چند نقاد کس طرح بعض نظریے والوں کو ان کی ٹوکری میں بیٹھا کر اٹھانے کی کوشش کر رہے، ابھی حال میں دو تین نقادوں نے ایک نظریے والے کی ٹوکری اس طرح اٹھائی جیسے وہ ''رام رام ست ہے'' کہہ رہے ہو۔ آپ ان کے مضامین ذرا غور سے پڑھ کر دیکھئے۔

سوال: معاف کیجئے'' آپ بھی تو جمالیاتی نظریے کے حامی ہیں؟

جواب: میں ''نظریے'' کا مخالف نہیں ہوں فنون میں نظریوں کی ہمیشہ اہمیت رہی ہے، میں تخلیق اور تنقید کے تعلق سے یہ کہتا ہوں کہ تخلیق میں فنکار کا نظریہ جب تک پگھل نہیں جاتا کھردرا پن دور نہیں ہو سکتا اور جمالیاتی انبساط حاصل نہیں ہو سکتا اور تنقید مختلف نظریوں کی روشنی حاصل کرتی رہتی ہے صرف یہ کسی ایک نظریے کی ہو کر نہیں رہ جاتی، اگر صرف ایک ہی نظریے کی روشنی حاصل کرتی ہے تو اسی حد تک کہ تجربے کے جمال کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ تجزیاتی مطالعے میں مدد کر سکے۔ مارکسزم ہو یا نظام نفسیات یا کوئی اور علم ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تمام علوم کی روشنی تنقید کی مدد کر سکتی ہے۔ مشرق اور مغرب میں علمائے جمالیات کی کمی نہیں ہے، جمالیات کو فلسفہ کی ایک شاخ تصور کیا جاتا رہا ہے اور فلسفیوں نے اس پرانے فلسفیانہ تصور کی روشنی میں اظہار خیال کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جمالیات کے تعلق سے فلسفیوں کے خیالات جتنے بھی اہم

ہوں فنون کو سمجھانے میں ان سے زیادہ مدد نہیں ملتی۔ میرے نزدیک جمالیات کوئی نظریہ نہیں ہے بلکہ جمالیات فنون کی روح ہے، تنقید جمالیات کی تلاش ہے تخلیقی فنکار کا تعلق حسن سے ہوتا ہے اور تنقید اس حسن تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے، تنقید حسن کی تلاش دریافت اور بازیافت ہے حسن کی نئی تخلیق کی نئی تخلیق ہے فنکار حسن کی نئی تخلیق کرتا ہے اور ناقد نئی تخلیق کی نئی تخلیق کرتا ہے، وہ بھی فنکار کی تخلیق کو جذب کر کے تخلیقی عمل میں مصروف رہتا ہے۔ میں نے بار بار واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ میری تنقید جمالیاتی نہیں جمالیات کی تلاش دریافت بازیافت اور حسن کی نئی تخلیق کا عمل ہے۔ کسی بھی فلسفہ جمال یا نظریہ جمال کو اوڑھا نہیں جا سکتا ورنہ یہ تو پھر وہی کمبل والی بات ہو جائے گی۔

سوال: آپ نے کہیں کہا ہے کہ ادب کی تنقید جب تک ''بدھیت'' تک نہیں پہنچتی۔ عمدہ تخلیقی تنقید جنم نہیں لے سکتی۔ ''بدھیت'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: جی وہاں میں نے کہا ہے اور یہی میرا نظریہ ہے یہ بنیادی طور پر تخلیقی عمل کا نظریہ ہے۔

سوال: آخر ''بدھیت'' سے آپ کی مراد کیا ہے؟

جواب: ''بدھیت یا Buddhahood کا مفہوم ہے کہ پہلے اچھی اور اعلیٰ تخلیق کو زیادہ سے زیادہ جذب کر کے مراقبہ یا Meditation میں جانا اس کے بعد اس تخلیق کے حسن و جمال کو پا لینے کی منزل آتی ہے اور جب ناقد کو حسن کی پہچان ہو جاتی ہے تخلیق کا جلوہ اسے نظر آ جاتا ہے تو کنول جیسا کوئی پھول کھلتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے پھر اس کی خوشبو پھیلنے لگتی ہے اور جشن منانے کا جی چاہنے لگتا ہے جشن مناتے ہوئے جی چاہتا ہے دوسرے بھی تجربے میں شامل ہو جائیں۔ میں نے منٹو شناسی رقص بتانِ آذری جمالیات حافظ شیرازی، مولانا رومی کی جمالیات اور امیر خسرو کی جمالیات وغیرہ میں اسی قسم کا جشن منایا ہے ''مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات'' اور ''ہندوستانی جمالیات'' کے بعض حصوں میں حسن کو شدت سے محسوس کر کے رقص کرنے لگا ہوں۔ بدھیت Buddhalord ایک فنومین ہے، ناقد ایسے فنومین کا متحرک نقش بن جائے تو اس کی تنقید یقیناً تخلیقی ہو جائے گی۔

سوال: اردو میں یہ 'بدھیت' اور کہاں ملتی ہے؟

جواب: کیسے ملے گی جبکہ اس کا وجود ہی نہیں ہے، ناقد کے 'ایغو' (ego) نے اسے کب جانا کب اچھے ادب کو دیکھ کر اردو کے کسی ناقد نے Meditation کیا، مراقبہ یا Meditation ایسا ہوتا کہ وقت ڈوبتا محسوس ہو اور پھر وہ جمالیاتی انبساط حاصل ہو جو ناقد دوسروں کو بھی دے سکے۔ انقادیات میں مراقبہ یا عبادت کو مکالمہ تصور کرتا ہوں ناقد اور فنکار اور اس کے فن کے درمیان ایک مکالمہ ہوتا ہے جو دیر تک جاری رہتا ہے۔ مکالمے میں گہرائی بھی پیدا ہوتی ہے اور اس کا دائرہ بھی وسیع

ہوتا جاتا ہے، مکالمے کی پہلی منزل خود ناقد کی ذات ہوتی ہے، خود کلامی Monologue کی منزل پھر وہ آخری منزل آتی ہے جب ''قاری ناقد'' دوسرے قارئین سے باتیں کرنے لگتا ہے، بدھیت کی منزل حاصل ہوتے ہی ناقد محبت اور انبساط کا پیکر بن جاتا ہے، دوسروں کو جمالیاتی انبساط عطا کرنے لگتا ہے وہ جمالیاتی انبساط جو اس تخلیق کی جمالیاتی سطحوں سے حاصل کیا ہے۔

سوال: آپ یہ کہتے ہیں کہ اردو تنقید جب تک نقادوں کے 'ایغو' (ego) سے نجات حاصل نہیں کرے گی پنپ نہیں سکتی؟

جواب: کہتا تو یہی ہوں لیکن ساتھ ایک اور بات کہہ دوں ego کا وجود ہی نہیں ہوتا یہ نقادوں کا بھرم ہے محض بھرم، 'ایغو' Misunderstanding ہے۔ جب تک Understanding نہیں ہوگی Misunderstanding جائیگی کیسے؟ یہ جو بھرم ہے 'ایغو' کا وہ اردو کے نقادوں کو لاشعور میں لے گیا ہے، یہ لوگ کسی قیمت پر اپنے 'ایغو' کو کھونا نہیں چاہتے اس لئے کہ انہیں لٹریچر کا پروہت یا Priest بن کر رہنا اچھا لگتا ہے، انہیں لذت ملتی ہے۔ ایک 'پروہت' کی طرح شاعروں ادیبوں کی کتابوں پر مقدمے دیباچے لکھتے ہیں، ان پر بڑا بننے کا خبط سوار ہو گیا ہے اس مرض کو جانتے ہیں کیا کہتے ہیں Megalomania۔

سوال: آپ جسے مراقبہ یا Meditation کہتے ہیں جس کے ذریعہ ناقد بدھیت یا Buddhahood تک پہنچتا ہے اس کی کمی تو واقعی محسوس ہوتی ہے پروفیسر کلیم الدین احمد کی تنقید سے آج کی تحریروں تک جانے کتنی مثالیں دی جا سکتی ہیں، اہم اور قیمتی موضوعات تو منتخب کر لیتے ہیں لیکن اس 'جگہ' کی کمی محسوس ہوتی ہے کہ جس جانب آپ اشارہ کر رہے ہیں۔

جواب: وقت کم ہے آخر میں ایک بات اور کہہ دوں۔ اچھی تخلیقات کے سامنے ناقد جب تک صرف ایسے Masculinemind کے ساتھ رہے گا اچھی تنقید جنم نہیں لے گی۔ فنون کا مزاج بنیادی طور پر Feminine ہے، عمدہ تخلیقی تنقید دونوں ذہن کی وحدت کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ مرد اور عورت کی بات نہیں ہے، یہ مزاج، رجحان اور نفسیات کی بات ہے۔ صرف Masculinemind کے ساتھ تنقید کی جائیگی تو اس کا وہی حشر ہوگا جو پروفیسر کلیم الدین احمد اور چند دوسرے ایغو پرست نقادوں کا ہوا ہے، ادبی اور فنی تنقید گیان دھیان کا تقاضا کرتی ہے اور اس کیلئے بدھیت کی سطح تک پہنچنے کی کوشش ضروری ہے۔ گوتم بدھ جیسے مزاج سے ہم آہنگی کا مطلب ہی یہی ہے کہ Masculine اور Feminine ذہن کی آمیزش ضروری ہے ادبی تنقید صرف ''میسکولین'' ذہن سے کام لے گی تو ظاہر ہے تنقید تباہ کن بن جائیگی بدھیت کی منزل حاصل ہوتے ہی ناقد محبت اور انبساط کا پیکر بن جاتا ہے دوسروں کو جمالیاتی انبساط عطا کرنے لگتا ہے وہ جمالیاتی انبساط جو اسے اچھی تخلیق سے حاصل ہوتا ہے اور وہ جمالیاتی انبساط جو اس تخلیق کی جمالیاتی سطحوں سے حاصل کیا ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ایک لہر نئی سی ہے

ساختیات کے عمرانی پہلو اور فلسفیانہ پہلو میں تفریق کے لئے یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ ساختیات نظریہ نہیں بلکہ ایک طریق کار ہے۔ کوئی اس طرح ساختیاتی نہیں بن سکتا۔ جیسے لوگ وجودی بنا کرتے تھے۔ مشاہیر ادب نے اس کی وضاحت الگ الگ طریقے سے کی ہے۔ اردو کے بلند قد ناقد ڈاکٹر وزیر آغا نے ساختیات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مغالطہ عام ہے کہ ساختیات کا مسئلہ صرف لسانیات کا مسئلہ ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ موجودہ صدی کے دوران مختلف Disciplines (لسانیات سمیت) میں جو پیش رفت ہوئی وہ بالآخر اس انکشاف پر منتج ہوئی کہ زندگی اور مادہ کے جملہ مظاہر کسی ٹھوس بنیاد کے بجائے ساختیہ یعنی Structure پر استوار ہیں۔ وزیر آغا لکھتے ہیں کہ ساختیہ سے مراد ڈھانچہ نہیں ہے۔ مثلاً اگر انسانی جسم کے بارے میں یہ کہا جائے کہ گوشت کے غلاف کے نیچے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ موجود ہے تو یہ ساختیہ کی نشان دہی نہیں ہوگی۔ کیونکہ ڈھانچہ ایک ٹھوس شئے ہے جب کہ ساختیہ ٹھوس اجزاء کے بجائے رشتوں (Relation) پر مشتمل ہوتا ہے۔ ساختیہ کے بعض بنیادی اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ساختیہ اپنے عناصر یا اجزاء کی حاصل جمع کا نام نہیں۔ وہ اس حاصل جمع سے ''کچھ زیادہ'' ہوتا ہے۔ مثلاً انسان کا جسم محض مختلف مادی عناصر ہی کا مرکب نہیں وہ ان کے علاوہ روح کا حامل بھی ہے۔ لہٰذا ساختیہ اپنے اجزاء کی حاصل جمع کے عقب یا پھر اس کے بطون میں بطور ایک ساخت یا سسٹم ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ علم الانسان کے باب میں بیسویں صدی نے ''خیال'' کے بجائے ساختیے کو اہمیت دی ہے کیونکہ خیال کا ایک اپنا متعین معنی ہوتا ہے جو اسے زمان و مکان میں گویا جکڑ لیتا ہے۔ جبکہ ساختیہ ایک ایسی ''شئے'' ہے جو اصلاً صرف رشتوں کی ایک ''اکائی'' ہے۔

ساختیہ ایک ایسا پیٹرن ہے جو ہمہ وقت تغیر پذیر رہتا ہے۔ مگر اس تغیر پذیر پیٹرن کے اندر ایسی غیر مرئی کھائیاں یعنی Grooves موجود ہوتی ہیں جو تغیرات کے باوجود پیٹرن کی ساخت کو قائم رکھتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں پیٹرن ان دماگوں یا رشتوں پر مشتمل ہے جو ہردم

بگڑتے بنتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ یہ کام ایک ایسے سسٹم یا ساخت کے اندر رہ کر کرتے ہیں جو آسانی سے تبدیل نہیں ہوتی۔ اس کی ایک عام سی مثال یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ انسانی چہرہ تبدیل ہو جاتا ہے لیکن زیر سطح چہرے کے خدوخال موجود رہتے ہیں۔ اس لئے جب ہم ایک طویل عرصہ کے بعد اپنے کسی کرم فرما سے ملتے ہیں تو تھوڑے سے توقف کے بعد اسے پہچان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ''کوڈز'' سلسلے کو اہمیت دی ہے اور بتایا ہے کہ ساختیہ ایک ایسا بند نظام یعنی Closed System ہے جس کا ایک مخصوص قاعدہ یا Algorithm ہے جسے کوڈ یا گرائمر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ باہر سے جب کوئی عنصر اس بند نظام میں داخل ہوتا ہے تو آن واحد میں اس کوڈ کی کھائیوں کے تابع ہو جاتا ہے۔ وزیر آغا نے مثال دیتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ عام زندگی میں زید ایک شخص ہے جس کے اپنے مخصوص اوصاف' ایک اپنی منفرد زندگی اور تشخص ہے۔ لیکن جب زید کو زبان کی گرائمر کے بند نظام میں داخل کیا جائے تو زید کا تشخص پس پشت جا پڑتا ہے اور وہ محض ''اسم'' کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح جب یہی زید سفر میں مبتلا ہو تو مسافر' اور اگر کسی پیشہ سے منسلک ہو جائے تو پیشہ کی مناسبت سے استاد' ساہوکار یا خدمت گار کہلائے گا۔ لہٰذا ہر ساختیے کی ایک اپنی مملکت خداداد ہوتی ہے۔ اس ضمن میں وزیر آغا نے اس نکتے پر بھی غور کیا ہے کہ جب کسی ساختیہ پر باہر سے کوئی سسٹم حملہ آور ہو تو ابتداً ساختیہ اپنی مدافعت کرتا ہے۔ بعینہ جیسے جسم پر کسی بیماری کے جراثیم حملہ آور ہوں تو جسم ان کا مقابلہ کرنے کے لئے Anti Bodics پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن اگر باہر کا سسٹم ساختیے میں داخل ہو جائے تو پھر ساختیہ سے اپنی قلب یا ہیت کے لئے بروئے کار بھی لاتا ہے۔ کلچر کے سلسلے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اگر وقتاً فوقتاً باہر سے کوئی تہذیب کلچر کے ساختیے میں داخل نہ ہوتی رہے تو کلچر پر انجماد طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن جب تہذیب حملہ آور ہوتی ہے تو کلچر اس نئے سسٹم کو اپنے اندر جذب کر کے گویا دوبارہ ہرا ہو جاتا ہے۔

انسان کے ذہنی ارتقا کا بھی ایک اہم واقعہ ہے کہ کسی مقام پر ذہن کے ساختیہ میں موسیقی کا سسٹم داخل ہوا جس نے انسان کو بعد ازاں فنون لطیفہ موسیقی کے مخصوص آہنگ کو خود میں سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر انسان کو یہ آہنگ حاصل نہ ہوتا تو وہ کبھی فنون لطیفہ وجود میں نہ لا سکتا۔ موسیقی کے علاوہ اور بھی سسٹم ہیں جو بعض اوقات انسانی ذہن کے ساختیہ میں داخل ہونے کے لئے کسی خاص فرد کا انتخاب کرتے ہیں ذہن انسانی کا ساختیہ عام طور سے باہر کے سسٹم کی دخل اندازی کو پسند

نہیں کرتا۔اس پر حدود عائد کرتا ہے اور جب مآل کار اسے اپنے اندر داخل کرتا ہے تو فی الفور اپنے بند نظام کے قواعد کے تابع کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

ساختیات کے نظریے سے قبل سوچ کا وہ انداز رائج تھا جو علت و معلول کو اہمیت دیتا ہے یہ اس مفروضے پر قائم تھا کہ شئے اپنا ایک ٹھوس وجود رکھتی ہے عمل دوسرے عمل کا نتیجہ اور نئے عمل کا محرک ہوتا ہے۔کائنات اور زندگی کے جملہ مظاہر ابتدا اور انتہاء کے درمیان ایک سیدھے خط پر سفر کرتے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی جدید طبیعات میں اس نظریے کو مسترد کر دیا۔اور کہا کہ شئے بجائے خود رشتوں کی ایک اکائی ہے۔ نیز یہ کہ شئے کو اس رشتے کے حوالے سے ہی جانا جا سکتا ہے جو اس نے دیگر اشیاء کے ساتھ قائم کر رکھا ہے اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں کہ طبیعات کے لئے برق ایسے مظہر کو مادے کی اکائی متصور کرنا مشکل ہو گیا تھا۔لہٰذا رویہ تبدیل کرنا پڑا اور مادے کی اکائی کو اساسی قرار دینے کے بجائے برقی قوت یا قوت کو اساسی قرار دے دیا گیا۔جب ایسا کیا گیا تو نئی اشیاء مثلاً الکٹرون دریافت ہو گئیں مگر اب یہ اشیاء مادے کی ٹھوس اکائیاں نہیں تھیں بلکہ محض رشتوں کی گرہیں تھیں اور ان رشتوں سے ہٹ کر ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔یہیں سے ساخت کے اس تصور نے جنم لیا جو حقیقت کو رشتوں کی ایک گرہ سمجھنے پر مصر تھا۔

لیکن ساخت کا یہ نظریہ محض طبیعات تک محدود نہیں رہا۔نفسیات،لسانیات،فلسفہ،علم الحیات، علم الانسان اور دیگر علوم میں بھی اسے خاصی اہمیت ملی ہے۔ ساختیہ کے اندر دوئی کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے وزیر آغا نے لکھا ہے کہ "ایک" کی کوئی ساخت نہیں ہوتی۔لیکن جب "ایک" دو میں تقسیم ہوتا ہے اور دونوں حصے ایک دوسرے کے روبرو آ جاتے ہیں تو ایک ایسا رشتہ وجود میں آ جاتا ہے کہ جس سے لاتعداد نئے رشتے پھوٹ پڑتے ہیں۔مثلاً جب ایک آئینہ کے مقابل دوسرا آئینہ رکھ دیا جائے تو عکسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جنم لیتا ہے۔اسی طرح ایک کے اندر دوئی کے جنم اور پھر اس کے دائرہ در دائرہ پھیلاؤ سے رشتوں کی ایک پوری دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ جسے ساختیہ کا پیٹرن کہا جاتا ہے۔ دوئی کے یہ سارے مظاہر انسانی ذہن کے ساختیے سے ماخوذ ہیں کیونکہ انسانی ذہن کا سٹرکچر بجائے خود شئے کو اس کی ضد سے پہچانتا ہے ذہن کے سوچنے کا انداز یہ ہے کہ وہ شئے کی پہچان اس فرق کی بناء پر کرتا ہے جو اس نے دیگر اشیاء کے ساتھ قائم

کر رکھا ہے۔ یہی اشیاء کے مابین سب سے بڑا رشتہ بھی ہے یعنی تضاد کا رشتہ! وزیر آغا نے یہ انکشاف کیا ہے کہ بیسویں صدی میں ساختیات کے ضمن میں دوئی کے جس تصور کو اہمیت ملی وہ مذہب، فلسفہ، تصوف میں پہلے سے موجود تھا۔ مثلاً مذہب میں خیر اور شر، اہرمزاور اہرمن اور سُر اور اُسر کے فرق کو بنیادی حیثیت تفویض ہوئی۔ چینیوں نے ین اور یانگ (مادہ اور نر) کے فرق کو اجاگر کیا اور صوفیہ نے جزواور کل کے مابہ الامتیاز کو مرکز مان کر اپنی بات کی ابتدا کی۔ اسی طرح فلسفے نے وجود (Being) اور موجود (Becoming) کے تضاد کو اپنا موضوع بنایا۔ دراصل اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں سائنس کی فتوحات نے کائنات کا ایک میکانکی تصور ابھارا تھا۔ یعنی کائنات ٹھوس ذرات پر مشتمل ہے جو اس کے Building Blocks ہیں۔ مگر بیسویں صدی کی سائنس اس نتیجہ پر پہنچی کہ کائنات کا ایک سٹرکچر ہے جس کے بطون میں ایک سسٹم یا گرائمر بھی ہے جس سے کائنات کا سارا تنوع جنم لیتا ہے۔ یہی بات مشرق کے مذہب اور تصوف کے سلسلوں نے بھی کہی تھی اور اسی حوالے سے خدا کے وجود کا اقرار کیا تھا اور بیسویں صدی کے علوم بھی خدا کا نام لئے بغیر اس ازلی وابدی سٹرکچر پر ایمان لے آئے ہیں جو اصلاً خدا کی لاتعداد صفات میں سے ایک صفت اور اس کے لاتعداد ناموں میں سے ایک نام ہے وزیر آغا نے ساختیہ کے دو چہروں کا ذکر کیا ہے ایک وہ جو باہر کی طرف ہے اور دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا جو اندر کی طرف ہے اور نظر نہیں آتا۔ مگر جس کی موجودگی کا علم ظاہر چہرے کی کارکردگی سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

ساختیہ کا ظاہر چہرہ رشتوں کا ایک جال ہے جس میں اشیاء ہمہ وقت ایک دوسری سے جڑتی اور الگ ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً کلچر کی سطح پر شادی بیاہ کی رسوم، صلح و پیکار کے مظاہر، گفتگو کے پیرائے، کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب وغیرہ یہ سب کارکردگی Performance کے تحت شمار کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ کارکردگی ایک خاص 'سسٹم' کوڈ یا گرائمر کے تابع ہوتی ہے جو ساختیہ کا مخفی چہرہ ہے۔ یہ مخفی چہرہ ظاہر چہرے کے رشتوں ہی کا ایک تجریدی روپ ہے۔ دراصل مخفی چہرہ بجائے خود ایک سسٹم یا کوڈ ہے جو دو طرح کے رشتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک رشتہ تو اختلاف اور تضاد کا ہے جسے Binary Opposition کہا گیا ہے اور جس کے تحت متبادل اشیاء میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے اور دوسرا رشتہ پیوستگی کا ہے جو عناصر کو جوڑ کر بلند سے بلند تر ہوتی ہوئی اکائیوں کے ایک تسلسل کو جنم دیتا ہے۔ گویا سابقوں اور لاحقوں سے جڑا

ہوتا ہے۔ وزیر آغا نے مثال دے کر ان دونوں کے فرق کو نمایاں کیا ہے کہ جب ہم کسی ریستوران میں کھانے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو ویٹر ہمارے سامنے مینو (Menu) لا کر رکھتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں کھانے کی دو Categories ہیں۔ ایک عمودی اور دوسری افقی ہے۔ عمودی فہرست میں کھانے کی مختلف اقسام ہیں۔ سوپ، چاول، سالن، میٹھا وغیرہ۔ یہ Syntagmatic فہرست ہے جس میں مختلف کھانے جڑ کر ایک Sequence بناتے ہیں۔ دوسری طرف افقی فہرست میں کھانے کی ہر قسم کے سامنے اس کے متبادل نمونے درج ہیں۔ یعنی سوپ کے سامنے ٹماٹر سوپ، کارن سوپ، مرغ سوپ وغیرہ ہمیں ان میں سے کسی ایک سوپ کا انتخاب کرنا ہے۔ یہ Paradigmatic فہرست ہے جو ''انتخاب'' کی بنیاد پر استوار ہے۔

تمام بحث سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زبان کا سٹرکچر اسی سے مشابہ ہے کیونکہ اس میں ایک خط الفاظ کے باہمی فرق کو اجاگر کرتا ہے جبکہ دوسرا خط ان کی باہمی پیوستگی کو۔ یوں زبان Selection اور Cambination کے دوگونہ عمل سے مرتب ہو کر ایک سٹرکچر بناتی ہے۔ سٹرکچر کا نظام تضاد اور انسلاک کا ایک تہہ در تہہ اور دائرہ در دائرہ نظام ہے۔ سٹرکچر کو اگر ہاکی کے کھیل سے تشبیہ دیں تو بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ ہاکی کے کھیل میں کھلاڑیوں کی پوزیشن ہمہ وقت تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی وہ گیند کی رفتار اور جہت کی مناسبت سے ہر دم تضاد اور انسلاک کے رشتوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ مگر ہاکی کے کھیل کا یہ منظر نامہ ہاکی کے کھیل کے قواعد وضوابط کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ کھیل کے دوران جب کوئی کھلاڑی کسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ریفری سیٹی بجا کر کھیل کو روک دیتا ہے۔ کھیل کے دوران ہاکی کے کھلاڑی جس تغیر پذیر پیٹرن کو وجود میں لاتے ہیں وہ اصلاً رشتوں کا ایک جال ہے۔ تاہم وہ اس ضابطے کے مطابق ہی اپنی صورتیں بدلتا ہے جو بطور ایک گرائمر، کوڈ یا سسٹم ہر کھلاڑی کے ذہن میں نقش ہوتا ہے۔ زبان کی گرائمر ہمارے اعماق میں موجود ہے اور ہم گفتگو کے دوران قطعاً غیر شعوری طور پر اس گرائمر کے مطابق ہی ترسیل کے ہزارہا پیکر ہمہ وقت تراش رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کارکردگی Performance کا عمل متنوع، تغیر پذیر اور پیچیدہ عمل ہے اور لمحہ بہ لمحہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف اس کے پس منظر میں موجود سسٹم چند مستقل نوعیت کے بنیادی اوصاف سے عبارت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر منصور عمر

انیس رفیع کا افسانوی سفر

انیس رفیع نے افسانہ نگاری کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب ترقی پسند ادبی تحریک کا سورج اپنی تمام تر تابانیاں دکھا کر غروب ہو رہا تھا اور جدیدیت کا کونپل پھوٹ رہا تھا۔ انہوں نے بھی عام جدید افسانہ نگاروں کی طرح اپنی افسانہ نگاری میں رموز و علائم کا سہارا لیا لیکن دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں اپنا افسانوی سفر تیز رفتاری کے بجائے اعتدال کے ساتھ جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ تیس برسوں کے دوران ان کا صرف ایک افسانوی مجموعہ ''اب وہ اترنے والا ہے'' شائع ہو سکا ہے۔ مگر اس مجموعہ کو جو شہرت ملنی چاہئے تھی وہ نہ مل سکی۔ اس کی وجہ غالباً دور از کار علامت نگاری ہے۔ حالانکہ اس مجموعہ میں شامل افسانے ''اب وہ اترنے والا ہے'' دو آنکھوں کا سفر' وش پان کتھا' پشت پر رکھا آئینہ' کشکول خالی ہے اور پولی تھن کی دیوار' اچھے اور فکر انگیز ہیں۔

اس افسانوی مجموعہ کے بعد بھی انیس رفیع کے افسانے رسالوں کی زینت بنتے رہے ہیں اور جدید افسانوی منظر پر ان کے نام اور کام نمایاں رہے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ شاید وہ بھی گروہی عصبیت کے شکار ہوئے ہیں اسی لئے انیس رفیع کو ناقد میسر نہیں آسکا۔ یوں بھی افسانوی ادب کو ناقدین نے بہت بعد میں اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اور جب ناقدین اس طرف متوجہ ہوئے تو ان کے سامنے روایتی اور ترقی پسند افسانوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا جن سے نمٹنے میں ان کا وقت بھی ختم ہو گیا اور زندگی بھی تمام ہو گئی۔ اور جن ناقدین نے جدید افسانوں کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی وہ ان افسانوں کی علامتی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ اس لئے کہ جدید افسانے ترقی پسند افسانوں سے یکسر مختلف تھے۔ جدید افسانوں میں ذات کے اظہار اور داخلی کرب و نشاط کو دبیز پردے اور علامتوں میں پیش کیا جانے لگا جسے سمجھنا دشوار ہو گیا۔ جبکہ ترقی پسند افسانوں میں فرد کے بجائے جماعت کا مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔ جہاں کھلی آنکھوں اور کھلے ذہن کے سامنے سب کچھ صاف صاف نظر آتا تھا اور قاری کو ان افسانوں کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے میں کوئی دقت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اس کے برعکس جدید افسانوں میں پلاٹ' کردار اور قصہ پن کی کمی اور علامت کی وجہ سے اسے قاری بھی میسر نہیں ہو پاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انیس رفیع بھی جدید افسانہ نگار ہیں اس لئے انہیں بھی ایک مخصوص طبقہ کے قارئین ہی ملے ہیں جن کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

انیس رفیع آل انڈیا ریڈیو وابستہ تھے اور اب دوردرشن میں ہیں۔ لہٰذا ملک کے مختلف حصوں میں ان کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اور جہاں جاتے ہیں وہاں کی تہذیب سے متعلق کوئی نہ کوئی کہانی ضرور گھڑ

لیتے ہیں۔ افسانہ ''قبائل'' آسام کے ایک قبیلہ سے متعلق ہے لیکن قدیم وجدید کا بہترین سنگم بھی ہے۔ پوری کہانی ''زالونی کلب'' کے نئے سال کے فنکشن کی ایک رات کی کہانی ہے۔ اس کلب کے ممبر زالونی فیملی کہلاتے ہیں۔

''زالونی تیل کے کنویں کے سرداروں کی فیملی ہے، ان کا ایک کلب ہے زالونی کلب' ہر نئے سال پر ایک تقریب منعقد ہوتی ہے۔ Zaloni Meet کہتے ہیں اسے Zaloni Meat تیل چائے اور جنگلات کے سرداروں کا سالانہ اجتماع ہے۔''

کلب انگریزی تہذیب کی دین ہے۔ جہاں انگریزی کلچر کے مطابق رقص وسرود کی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔ لیکن جب مشرق کا پروردہ اس کلب میں داخل ہو جائے تو وہ ایڈجسٹ نہیں کر پاتا ہے۔ زالونی میٹ کا بھی یہی حال ہے کیونکہ ''زالونی کسی بستی یا فصل کا نام نہیں ہے یہ ریت کی ایک قسم ہے۔ زالونی، کتنی موسیقیت ہے اس نام میں۔ مگر ہے بالو۔ دانتوں کے نیچے آجائے تو کرکری'' افسانہ نگار نے زالونی میٹ کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے۔ ''زالونی میٹ نام ہے جنگل میں منگل کا۔ رقص، موسیقی، شباب اور کباب اس Meat کے پیمانے ہیں۔'' رقص وسرود کی محفل گرم ہے۔ اس کہانی کی مرکزی کردار ''برگوبائیں نے اپنے آدھے کپڑے فلور پر گرادئے ہیں'' اور افسانہ نگار کو' بازوں سے پکڑ کر فلور پر گھسیٹ لیتی ہے۔ لیکن افسانہ نگار اس کے ساتھ رقص کرنے سے قاصر ہے اور یہ کہہ کر اپنی جان چھڑاتا ہے کہ'' دیہاتی ہوں کھانا کھاتے۔ کیا نا...... اور پانی پینے کے علاوہ کچھ سیکھا ہی نہیں'' برگوبائیں...... در اصل آہوم قبیلے کی سوکا پھا ہے۔ سوکا پھا جس نے اپنی رعایا کی حفاظت کے لئے وحشی درندوں سے لیکر شہری لٹیروں تک سے ٹکر لی تھی۔ دراصل یہ سوکا پھا سات صدیوں کے ٹکراؤ کی کہانی ہے۔ جب جب رعایا درو سے کراہتی ہے تب تب سوکا پھا وارد ہوتی ہے۔

اس کہانی کا سب سے اہم کردار وہ ہے جو منظر سے غائب ہے اور افسانہ نگار جس سے مخاطب ہو کر زالونی کلب اور برگوبائیں کی تفصیل بیان کرتا ہے اور جس برگوبائیں سے Bastard جیسی گالی سننے کے باوجود مزاحمت نہیں کر پاتا ہے اور اس نا معلوم کردار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے''

''تم خوش ہونا میری اس سزا پر۔ میں اپنی اس سزا اور تمہاری خوشی کو ایک ہی سمجھتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھ میں بھی مزاحمت کی ہمت تھی یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے اندر بھی ایک قبائلی ہے۔'' یہ نا معلوم کردار دراصل اس کی مشرقیت اس کے محبوب اور اس کے تقدس کی علامت ہے اور قبائلی وحشی پن کی علامت۔ جس پر قابو پانے اور خود کو اخلاقی بلندیوں پر فائز کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

آسامی تہذیب تمدن سے متعلق انیس رفیع کی ایک دوسری کہانی لا ہے ہے' رفتہ رفتہ ' ہے۔

یہ کہانی آسامی تہذیب اور پھوکن کردار کے گرد گھومتی ہے۔ موسم بہار یعنی مارچ/اپریل کے مہینہ میں ایک مقامی ناچ ہوتا ہے جسے بیہو ناچ کہتے ہیں۔ اس ناچ کے دوران کوئی نوجوان کسی لڑکی کو بھگا کر لے جاتا ہے اور پھر کچھ دنوں بعد وہ شادی کر کے یا بغیر شادی کئے لوٹ آتا ہے اور اسے سماج والے معاف کر دیتے ہیں۔ پھوکن جو دوردرشن کا ملازم بھی ہے اور ڈائرکٹر دوردرشن (افسانہ نگار) کا چہیتا بھی آسامی تہذیب سے روشناس کراتا ہے اور پھر:۔

''بیہو کے جب آخری ایام چل رہے تھے ایک دن وہ میرے پاس آیا...... اس کے ساتھ اس کی دیدی بھی تھی اور ایک گورا چٹا خوبروں نوجوان بھی...... میں نے اس کی دیدی اور لڑکے کی طرف اشارہ کیا یہ؟ وہ سمجھ گیا فوراً بولا صاحب میری دیدی' بیہو سے بھگا کر لایا ہے۔ ان کے پاس رہنے کو کوئی گھر نہیں ہے کچھ ہی دنوں کی بات ہے گاؤں کے نام گھر (مندر) میں جا کر معافی لے لیں گے تو سب کا آشیرواد مل جائے گا۔ ماتا پتا، پنڈت جی سب کا۔ مگر ابھی تو انہیں آسرا آپ اپنی سرونٹ کوارٹر......''

کہانی ''لا بے لا بے' رفتہ رفتہ بیک وقت دو سطحوں پر آگے بڑھتی ہے۔ ایک سطح آسامی تہذیب وتمدن اور دوسری سطح سرحدی علاقوں میں ہمارے فوجی جوانوں کی بیجا سختی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوردرشن کے ڈائرکٹر (افسانہ نگار) کو خبر ملتی ہے کہ اس کا چپراسی .C.R.P.F کی قید میں ہے اور جب وہ اسے آزاد کرانے کیلئے اپنی کار سے بازار پہنچتا ہے تو ''چند مسلحہ جوانوں نے اسے Cordon کر لیا۔ ڈرائیور نے بتایا ڈائرکٹر صاحب ہیں۔ ہوں گے ڈائرکٹر۔ چل اتر گاڑی سے۔ کھال اتار کر بھس بھر دونگا۔'' جیسے سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''غروب سے پہلے'' بھی سرحدی علاقوں میں ہمارے فوجی جوانوں کی بیجا سختی کی کہانی ہے۔ اس میں گم شدہ کتاب کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یعنی ایسی گم شدہ چیز جس کی اصلیت اور حقیقت کا علم خود فوجیوں کو بھی نہیں ہے۔ اور پھر Combing Operation کے نام پر خانہ پوری کرنے کے لئے کسی بھی بیگناہ کو پکڑ کر قتل کر دینا روزمرہ کا معمول ہے۔ اگر کسی کی حیات باقی ہے تو وہ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کہانی کی حاملہ عورت جسے پکڑنے کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ:

''مگر سر آج گاؤں میں Combing Operation کا آخری دن ہے۔ بہت کچھ برآمد ہونے کا امکان ہے۔ شاید آپ کی وہ کتاب''

اور پھر وہ تلاشی کے مرحلے سے کچھ اس طرح گذرتی ہے۔

''ٹھیک ہے' سنتری پیٹ کے اوپر کی تلاشی لو۔''

''یہ لو میں نے خود ہی بلاؤز اتار دئے۔ اب آیا یقین کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔''

''سالی اتر...... چل پہن بلاؤز......!

''بچہ ہوگا تو بلاؤز کھولنا ہی پڑے گا دودھ پلانے کے لئے اور صاحب تمہارے لئے تو یہ کوئی خاص بات نہیں۔ چونک پڑے ایسے کہ پہلا بلاؤز......''

اس طرح ذلیل وخوار ہونے کے باوجود وہ عورت زندہ بچ کر نکل جاتی ہے لیکن ایک عرصہ بعد اسی کوم بنگ آپریشن کے دوران ایک چھوٹے بچے کو گولی ماردی جاتی ہے اور سنتری فخر سے کہتا ہے کہ:

''گولی ٹھیک مغز پر پڑی۔ جہاں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ایک انچ بھی نہیں ہلا سر......!''

''یو بلاڈی سوائن۔ کیوں گولی ماری اسے؟''

وہ وہ اس لئے سر کہ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی ملا!''

یہ کتاب دراصل اس نامعلوم چیز کی علامت ہے۔ جسے بہانہ کر ہمارے فوجی جوان بے قصور افراد کی تلاشی لیتے ہیں اور پھر اسے قتل کر دیتے ہیں۔ ''کہا لبیک ہجو نے'' کردار اور پلاٹ کی کہانی ہے۔ یہ دراصل شر میں خیر کے پہلو کی کہانی ہے۔ ہجو ایک ایسے طالب علم کی کہانی ہے جو پڑھنے لکھنے سے زیادہ کھیل کود اور سنیما بینی پر توجہ دیتا ہے۔ بالخصوص اسے متھری اور مختار کی فلمیں زیادہ پسند ہیں۔ چنانچہ جب اسے تعلیم حاصل کرنے کے لئے گاؤں سے کلکتہ بھیج دیا جاتا ہے تو وہاں بھی اپنے اطو ماما کے ساتھ فلم بینی کے شوق کی تکمیل کرتا ہے اور بالآخر تعلیم مکمل کئے بغیر عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اس کا جھکاؤ کسی ایک طرف نہیں بلکہ اس نے درمیان کا راستہ نکال لیا ہے بقول افسانہ نگار: ''ہجو متھری کی طرح ہیرو اور ویلن کے درمیان والے راستے پر چلتا رہا۔ یعنی اچھے اور برے کے درمیان جو راستہ ہوتا ہے یہ راستہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ بس آجاتا ہے نظر فلم بین آنکھوں کو۔ ایسا اس نے کسی منصوبے کے تحت نہیں کیا تھا یونہی پاؤں چل پڑے تھے اس راہ پر'' ہجو نے کبھی کسی کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ہانسو ماما جب حج کر کے لوٹے اور روزہ نماز اور حج کے فضائل بیان کئے جب بھی ہجو پر کوئی اثر نہیں ہوا اور پھر ایک دن اچانک ہانسو ماما اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہانسو ماما کے انتقال کے بعد اچانک ہجو کی زندگی میں انقلابی تبدیلی آئی۔ وہ پنج وقتی نمازی ہو گیا لوگوں نے سمجھا کہ ہانسو ماما کے انتقال نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی ہے لیکن ہجو سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ اس تبدیلی کا راز کچھ اور ہے:

''تم نے پچھلے ماہ ٹی وی پر متھری کا انٹرویو نہیں دیکھا۔ معلوم ہے کیا کہا متھری نے اپنے اس انٹرویو میں کہا میں اپنی عمر کی آخری منزل میں ہوں۔ پچھلے پچاس برسوں سے فلم اور گھر میں کامیاب زندگی گذارتا آرہا ہوں آپ Fans کی دعائیں تو میرے ساتھ تھیں ہی مگر میری اس کامیابی کے پیچھے میری نماز ہے...... میری نماز میں جب کوئی میرا ساتھ دیتا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

تو کیا تم؟ راوی نے تعجب خیز لہجے میں سوال کیا۔

"دعاء کرو کہ میں اسی طرح مقری کا ساتھ نبھا سکوں"

یہ ہے اس کہانی کا نقطہ عروج اور اختتام گویا ججو کی زندگی کا آئیڈیل بانسو ماما نہیں بلکہ مقری ہے۔ گویا افسانہ نگار نے فلم بینی کی بری عادتوں میں بھی بھلائی اور نیکی کا پہلو نکال لیا ہے۔ اس طرح ہم اسے ایک نفسیاتی کہانی بھی کہہ سکتے ہیں۔

انیس رفیع کی ایک اہم علامتی کہانی "قصہ کھلے سم سم کا" ہے۔ اس کے عنوان پر نظر پڑتے ہی علی بابا اور چالیس چور کا واقعہ ذہن میں گھوم جاتا ہے۔ لیکن انیس رفیع نے کمال ہوشیاری کے ساتھ اس پرانے قصے سے علامت کے سہارے نیا قصہ تراش لیا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں میں انتظار حسین نے خاص طور سے پرانی کہانیوں سے نئی کہانیاں اخذ کی ہیں "قصہ کھلے سم سم کا" خالص جنسی کہانی ہے لیکن اسے علامت کے دبیز پردے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اصل تک عام قاری کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ علی بابا مرد کے عضو مخصوص کی علامت ہے اور سم سم کو عورت کے عضو مخصوص کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ دونوں جنس مخالف ہم آغوش ہونے کے لئے بیتاب ہیں لیکن کسی وجہ سے علی بابا اپنے ہوش وحواس کھو چکا ہے اور لاکھ کوششوں کے باوجود اس میں حرکت نہیں ہوتی۔ نسوانی کردار کی زبان سے یہ جملے ادا ہوتے ہیں! "جس چاؤ سے اٹھا رہی ہوں اس سے تو زندہ کیا مردے بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ......دلار کر، چمکار کر، تھپک تھپک کر اٹھا رہی ہوں مگر اٹھتا ہی نہیں لگتا ہے، بہت جاگنے کے بعد سویا ہے۔

یا پھر مکالمہ کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں: " کھلے سم سم میں علی بابا کا داخل نہ ہونا کچھ عجیب نہیں لگتا۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ اس دروازے سے ہو کر گذرنے سے لذتوں اور نعمتوں کی کشتیاں حاصل ہوتی ہیں۔ کہیں وہ اندھا اور بے حس تو نہیں ہو گیا"

"......اس کے سر کو سم سم کی چوکھٹ پر رکھ کر سہلاؤ ممکن ہے آنکھ کھل جائے اور اٹھ کھڑا ہو۔ اٹھے گا تو اندر ضرور داخل ہوگا۔ یہ علی بابا کی فطرت ہے" علی بابا کو ہمیشہ چالیس چور کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ہر چند کہ وہ بہادر انسان ہے مگر جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ چالیس چور غار سے باہر جا چکے ہیں جبھی وہ سم سم میں داخل ہوتا ہے۔ پرانے قصے کے اس پہلو سے بھی انیس رفیع نے فائدہ اٹھایا ہے۔

"ایک انجانے خوف نے سلا دیا ہے اسے"

"اتنا ہی خوف تھا تو یہاں آیا ہی کیوں؟ شریف چھاتیوں سے دودھ پینے والے یہ ڈرپوک جنگل میں لکڑیاں کاٹنے آتے کیوں ہیں۔ خوف لیکر یہاں آنے والا زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور زندہ رہ بھی گیا تو اٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکتا"

''علی بابا بزدل نہیں ہوتا، میں بھی چاہتا ہوں کہ وہ اٹھے اور کھلے سم سم سے داخل ہو جائے غار کے اندر۔ گہرا اندر۔ بہت اندر کہ باڑھ آ جائے۔ گھاٹیاں اور کھائیاں بھر جائیں لبالب......''

سم سم طوائف کے کوٹھے کی بھی علامت ہے۔ اور چالیس چور کوٹھے کی سیر کرنے والے افراد ہیں۔ اور علی بابا غار کے دہانے پر اتفاقیہ پہنچنے والا شریف انسان۔ وہ نہیں چاہتا کہ غار کے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے کوئی دیکھ لے۔ بلکہ غار کے باہر کھڑا ہوا بھی رہنا اسے پسند نہیں کیونکہ وہ غریب مگر عزت دار آدمی ہے نیز یہ کہ غار کے اندر کی دولت اور راستے سے بھی وہ پوری طرح واقف نہیں ہے۔ یہی وہ انجانا خوف ہے۔ جس میں علی بابا گھرا ہوا ہے اور اپنے حواس مجتمع نہیں کر پاتا ہے۔ اور اسے مردہ قرار دیدیا جاتا ہے۔ اور حکم ہوتا ہے کہ:

''...... چلے جاؤ فتح علی کے قبرستان میں لے کر علی بابا کی لاش کو۔ دفن کر دو اس کہانی کو۔ سالے ٹائم خراب کرتے ہیں، دوسرا کون ہے باہر۔ آ بھائی اندر آ جا۔ دروازہ کھلا ہے۔''

''دوسرا...... وہ تو پہلے کے بعد ہی آ جاتا ہے۔''

کہانی یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے۔

اس کہانی پر منٹو کی کہانی ''ٹھنڈا گوشت'' کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ''ٹھنڈا گوشت'' کی ہیروئن اپنے سر پر سے جنسی خواہش کی تکمیل چاہتی ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے ایک مردہ لڑکی کے ساتھ جا کر نیکی...... سے وہ اپنی قوت مردانگی سے محروم ہو چکا ہے تو وہ شدت...... اسے قتل کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس ''قصہ کھلے سم سم کا'' کی عورت ایک طوائف ہے جو علی بابا سے جنسی رشتہ صرف اس لئے استوار کرنا چاہتی ہے کہ اس سے...... فائدہ حاصل ہونے والا ہے۔ مگر جب اسے ناکامی ہوتی ہے تو اس کے جذبات اس لئے برانگیختہ نہیں ہوتے کہ دوسرا مرد باہر انتظار میں اس کے جذبات کی تسکین کیلئے موجود ہے۔

گرچہ یہ کہانی علامتی ہے مگر اس کی زبان بہت ہی صاف اور سادہ ہے۔ جس کی وجہ سے کہانی میں ایک فطری بہاؤ پیدا ہو گیا ہے اور روانی اور برجستگی بھی آ گئی ہے اور کہانی پن بھی پیدا ہو گیا ہے۔

انیس رفیع کی کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جنہیں علامت کی دبیز تہہ نے لاینحل بنا دیا ہے مثلاً میزبان پانی اور چاہ نشیں وغیرہ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ جدید افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی انیس رفیع نے تہہ در تہہ علامت نگاری سے گریز کیا ہے اور اپنی کہانیوں میں اعتدال کی راہ اپنائی ہے۔ لہٰذا مجھے کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ انیس رفیع نے جدید افسانوی ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے اور مستقبل میں بھی ان سے اچھی کہانیوں کی امید کی جا سکتی ہے۔

سید احمد قادری

ذوقی کا ناول ''ذبح'' کا تجزیاتی مطالعہ

''ذبح'' میں مشرف عالم ذوقی نے دور جدید میں پرانی قدروں اور روایتوں کے ساتھ ساتھ ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ اس ناول کو ذوقی نے پرانی صدی کی مثبت روایتوں اور قدروں کے حادثات اور واقعات کو نئی صدی کے نام معنون کیا ہے اس معنی خیز جملے کے ساتھ'' کہ اب ہم تیار نہیں ہیں بار بار ذبح ہونے کیلئے۔''

مشرف عالم ذوقی کے فکروفن کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت ان کے ماضی اور ان کے حال سے جو لوگ واقف ہیں، یا جن لوگوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ ذوقی کے بچپن اور جوانی کے درمیان کہنے کو تو چند دہائیاں ہیں، لیکن یہ چند دہائیاں صدیوں پر بھاری ہیں۔ اس لئے کہ ذوقی نے جس وقت صوبہ بہار کے ایک چھوٹے سے مضافات سے گھرے تاریخی شہر آرہ میں آنکھیں کھولیں اس وقت ملک آزاد ہو چکا تھا اور تقسیم کا درد جھیل رہے لوگ تذبذب کے شکار تھے۔ یہ دور انتشار، عدم استحکام اور تبدیلئ وقت اور حالات کا تھا۔ جاگیردارانہ نظام ختم ہو رہا تھا اور اس کے بطن سے ایک نئے نظام کا وجود سر ابھار رہا تھا۔ وقت بہت تیزی سے بدل رہا تھا اور وقت کے بہتے تیز دھارے میں بہہ جانا سبھوں کے لئے ممکن نہیں تھا، خاندانی روایات اور قدروں سے جن لوگوں کی پہچان تھی، ان کے لئے یہی سب سے بڑی دولت، ہمت اور طاقت تھی۔ ناول نگار ان حالات کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔۔۔

'' کہتے ہیں چودھری کا خطاب انگریزوں کا دیا ہوا تھا۔ میں نے جس وقت آنکھ کھولی، چودھریوں کی آن بان شان کا جنازہ اٹھ چکا تھا...... صرف وہ کہانیاں باقی تھیں، جہاں دینے والے اور بانٹنے والے ہاتھوں کے تذکرے تھے...... جہاں حسن وشباب کی داستانیں تھیں، جہاں خوشی اور انعام میں سب کچھ لٹا دیئے جانے کے قصے تھے۔ ایسے ایسے قصے جنہیں سنانے بیٹھوں تو یہ کہانیاں د کبھی ختم نہ ہونے والی داستان بن جائیں۔ آج جنہیں سن کر طبیعت خوش نہیں ہوتی، بلکہ ایک طرح کا غصہ امڈتا ہے...... کیسی کیسی داستانیں اور کیسے کیسے ان داستانوں کو سنانے والے لوگ......

وقت ساری داستانوں کو اچک لیتا ہے...... چودھری خاندان نے اگر بلندی دیکھی تھی تو

میری پیدائش کا زمانہ چودھری نسل کی تنزلی کا زمانہ تھا' جب چھوٹے چھوٹے کہے جانے والے لوگ بڑے بنتے جارہے تھے' تجارت میں ترقی کررہے تھے' عالیشان گھر بنا رہے تھے' بینکوں میں پیسے بھرے جارہے تھے۔

اور یہاں......

میں چودھری رشید کا دوسرا بیٹا...... میں اس بات کا گواہ ہوں کہ بینک میں پیسوں کا ہونا تو دور کی بات' مہینے کے آخر دن ہوتے ہی پیسوں کے لالے پڑ جاتے تھے۔

شان تو کب کی ختم ہو چکی تھی...... صرف ابا کی باتوں میں زندہ تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری پیدائش' جس زمانہ میں ہوئی' اس وقت سیکولرزم کی ہوا چل رہی تھی۔ وقت کے ساتھ ہم سب نئی نئی تبدیلیوں کا دھواں پی رہے تھے'' (صفحہ ۹۲۔۹۳)

مشرف عالم ذوقی کے اس ناول کا ہیرو دراصل عبدل ہے' جو بہشتی ہے' مشک سے پانی بھرنا اس کا خاندانی پیشہ رہا ہے۔ تبدیلیٔ وقت اور حالات کا شکار' جہاں ایک طرف جاگیردار اور زمیندار لوگ ہیں' وہیں روایتی مشک لئے عبدل جیسے لوگ بھی ہیں وہ بدلتے وقت اور حالات کے بے رحم ہاتھوں مجبور اور بے بس ہیں۔ عبدل کا باپ اپنے خاندانی اور روایتی مشک کو سونپتے وقت بہت خوش تھا' اس وقت عبدل کا باپ اس بات سے بے خبر تھا جب روایتوں اور قدروں کی تنابیں اکھڑنے لگیں گی' وقت کے طوفان میں اس کا یہ روایتی اور خاندانی پیشہ کی بھی اہمیت باقی نہیں رہے گی اور جب عبدل ایسے ناگفتہ بہہ حالات سے دوچار ہوا تو اس کے اندر کے ایقان واعتماد کو بڑی ٹھیس لگی' اس کے خوابوں کی بنیادیں ہل گئیں اور اس کی زندگی درد مستقل بن گئی۔ حالانکہ اس کے باپ نے جس چودھری کی عمارت میں اسے اپنا خاندانی پیشہ اسے سونپا تھا' اس عمارت کی رونق کو وہ دیکھ چکا تھا اس لئے اس کے خواب وخیال اور وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک دن یہ پیشہ اسے نہ صرف اس عمارت سے دور کر دے گا بلکہ دو وقت کی روٹی کا ملنا بھی مشکل ہو جائے گا اور زندگی نہ صرف اس کے لئے' بلکہ اس کے پورے خاندان کے لئے عذاب بن جائے گی۔

''عبدل نے تو گھر کی رونق دیکھی تھی اور بے رونق دیواروں کو بھی۔ چودھریوں کے خوشحالی کے دن بھی دیکھے تھے کہ جب ہاتھی پالے جاتے تھے۔ بیگمات ڈولیوں میں سفر کرتی تھیں۔ آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ دالان خانے میں محتاج اپنی اپنی فریاد کے ساتھ موجود

ہوتے۔ اس کا باپ غفار سارا سارا دن باہر سے پانی لا کر مٹی کے بڑے بڑے مٹکوں اور گھڑوں میں بھر رہا'' (صفحہ ۶۲)

ایسے بارونق حویلی کی درودیوار سے کبھی روشنی پھوٹتی تھی' اندرون حویلی اور بیرون حویلی میں زندگی رقص کرتی تھی اور شان و شوکت کے نغمے ہر سمت بکھرے رہتے تھے۔ لیکن وقت کی ایک انگڑائی نے سب کچھ بدل دیا۔

''غلامی کے زمانے تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلا۔ پھر آزادی کی نئی اڑان نے سب کچھ ختم کرنا شروع کر دیا۔ چودھریوں کی چودھراہٹ مر گئی۔ پاکستان بنا تو گھر چھوڑ چھوڑ کر لوگ پاکستان جانے لگے ساری جائیداد اونے پونے بیچ کر لوگ چلے گئے۔ چودھریوں کے محلے اور چودھرانے کی رونق ختم ہوگئی۔ چودھری خاندان پر زوال آ گیا۔'' (صفحہ ۶۳۔۶۴)

حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ شکست و ریخت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا' بدلتے وقت اور حالات سے سمجھوتہ خاندانی وقار' عظمت و حشمت کے منافی تھا۔ ٹوٹ کر بکھر جانا گوارہ تھا' لیکن جھک جانا شان و شوکت کے خلاف تھا۔ ایسے لوگ بظاہر زندہ تھے' لیکن یہ زندگی موت سے بدتر تھی۔

''..........اور یہاں برسوں سے ان زندہ لاشوں سے جو بدبو اٹھ رہی ہے' وہ تم سب کو کبھی محسوس نہیں ہوتی؟'' (صفحہ ۳۱)

اس امر کا احساس جہاں ایک عام عورت سلامت چچی کو تھا' وہیں بذات خود چودھری بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ۔۔۔

''خاندانی وقار کی میت رکھی ہے میاں 'انا للہ و انا الیہ راجعون' نماز جنازہ پڑھنے کا انتظار ہے۔ بس اور اس لاش کو ہمیشہ کیلئے پرکھوں کے قبرستان میں دفنا دینا ہے۔

چودھری رشید کے آنسو نکل آئے تھے۔'' (صفحہ ۶۹)

چودھری رشید کا کردار جو کہ خاندانی جاہ و جلال' عزت و افتخار اور پرانی روایتوں اور مثبت قدروں کی علامت بن کر اس ناول میں ابھرا ہے' وہیں بہشتی عبدل' جسے مشک سے پانی بھرنے کے سوا کوئی ہنر نہیں معلوم۔ وہ بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ٹوٹتی روایتوں اور بکھرتی قدروں کا علامتی کردار ہے۔ دونوں کردار اپنے اپنے محور پر ہے جو اہم اور طاقتور ہیں۔ حالات کے

تھپیڑوں سے مجبور ہو کر عبدل اپنے خاندانی مشک سے نجات چاہتا ہے' تا کہ وہ روز روز کی بھوک کو ختم کر سکے' اپنی بہت پیاری اور چاہنے والی بیوی اور بچوں کی زندگی کا سہارہ بن سکے۔ وہ کافی تگ و دو کرتا ہے' بجلی مستری بننا چاہتا ہے' کوئی دوسرا دھندہ کرنا چاہتا ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی کہ اسے کہیں کوئی دوسرا کام نہیں ملتا۔ حالات جانگسل ہوتے گئے' بیوی بستر پکڑ لیتی ہے' بیٹی کا عشق مذاق بن جاتا ہے' بیٹا باغی ہو جاتا ہے' اس طرح عبدل کا پورا خاندان پوری طرح ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ ایسے تمام حالات اور حادثات سے واقف چودھری رشید کا ایک بیٹا جو اپنے خاندانی روایات اور قدروں کے برخلاف ایک آفیسر بن جاتا ہے وہ عبدل کے ساتھ ہوئے ظالمانہ رویہ کے لئے اپنے خاندان کو ذمہ دار سمجھتا ہے۔

''رات گئے اچانک کمرے میں پرانی یادوں کا حملہ ہو جاتا.......... سب اپنے تواریخ کی دھندلی فلموں کی طرح نگاہوں کے آگے چلنے رینگنے لگتے...... اچانک کانوں کے پاس ایک تھرتھراتی سی آواز گونجتی.........

''منا بابو.......... جب ایک دن تم افسر بن جاؤ گے تو.......... ''میرے سامنے واسکو ڈی گاما جیسا کھڑا ہو جاتا' عبدل.......... مشک کی پٹی پیٹ سے باندھے۔

تقریباً ننگ دھڑنگ۔ لمبا چوڑا۔

''تمنا بابو.......... ''

آواز بار بار شب خوں مارتی...... ''تم سن رہے ہونا منا بابو...... '' حال ایک دم سے اچانک ماضی کی طرف چھلانگ لگا دیتا...... کمرے میں اٹھ کر ٹہلتا ہوں تو لگتا ہے' عبدل کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کے قصوروار ہم ہیں' ہمارا خاندان۔ ابا نے اچانک اس کی چمڑے کی پٹی میں چھرا بھونک دیا۔ پانی کی جگہ سرخ سرخ خون گر رہا ہو۔

عبدل کے بعد کی دوسری نسل بھی اس طرح ذبح کر دی گئی خاموشی سے...... ہم تو لٹ گئے میاں...... جاگیریں نہیں رہیں۔ تمہارا کیا کریں۔ میں جیسے اچانک دھند میں دو قدم آگے بڑھے اور مقتل کی طرف اٹھ کر گئے۔

اشرف کے خون کی سرخیاں دھبوں کی طرح زمین اور آسمان پر بچھ گئیں۔

ایک خاندان دیکھتے دیکھتے اجڑ گیا۔ برباد ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک ایک پیشہ گہن میں

کھو گیا اور تواریخ کی بوسیدہ قبر بارش کے پانی سے بیٹھنے لگی۔'' (صفحہ ۱۴۴۔۱۴۵)

یہ شدتِ احساس ہی چودھری خاندان کے اس حساس چراغ کو کچوکے لگاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ عبدل کے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ اس کی تلافی کر لے اور پوری طرح ٹوٹ کر بکھر جانے اور اپنے وجود کو ختم کر دینے والے عبدل کے بیٹا اسلم کو جو رکشہ چلا کر اپنے پیٹ کے دوزخ کو ٹھنڈا کر رہا ہے' اپنے ساتھ لیجا کر ساتھ رکھے۔ لیکن اسلم زندگی کے نشیب و فراز کو بخوبی سمجھ چکا ہے۔ وہ رکشہ چلانا' چوری کرنا اور قتل کرنا زندگی گزارنے کیلئے بہتر سمجھتا ہے' بنسبت چودھری خاندان کے ایک نوجوان کے ساتھ رہنے کے' اس کے ساتھ زندگی جینے کے۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ چودھری خاندان کے ایک فرد کی اس پیشکش کو بڑی سرد مہری سے ٹھکرا دیتا ہے اور سفاکانہ انداز میں کہتا ہے۔

''مجھے ابا نہیں بننا ہے۔'' (صفحہ ۱۴۹)

منا بابو...... اب ذبح نہیں ہونا ہے مجھے...... ابا کی طرح۔ ابا مرے نہیں' سیدھے جانور کی طرح ذبح ہو گئے...... آسانی سے۔

ہاں

ہم تیار نہیں ہیں' اس طرح' بار بار ذبح ہونے کے لئے۔'' (صفحہ ۱۵۰)

اسلم کا یہ جواب ایک تازیانہ ہے پرانی روایتوں اور قدروں کے لئے۔۔۔

''ذبح'' بے حد معیاری اور معنویت سے بھرپور ناول ہے' جو عصر حاضر اور عہد قدیم کے درمیان کے تصادم کی بھرپور عکاسی کرنے میں کامیاب ہے۔ گرچہ اس موضوع پر کئی ناول لکھے گئے ہیں' لیکن ناول کا محور عام طور پر جاگیردار' زمیندار یا نواب ہوئے ہیں' اس نظام سے وابستہ وہ فرد یا افراد نہیں ہوئے' جو بدلتے وقت اور حالات کا شکار ہوتے اور جاگیردارانہ نظام کے انحطاط سے متاثر ہوئے اور ان کی بھی زندگی بے وقعت اور بے معنی ہو کر رہ گی۔ موضوع' کردار' اسلوب اور معنویت کے اعتبار سے ذوقی کا یہ ناول اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ ناول نگار چونکہ اس بدلتے وقت اور نظام کا خود ایک کردار رہ چکا ہے' اس درد کو جھیل چکا ہے اس لئے اس کے اندر مسلمانوں کی مظلومیت پوری طرح در آئی ہے' جس کا وہ لاشعوری طور پر نہ صرف اظہار کرتا ہے' بلکہ اپنے غم و غصہ پر بھی قابو نہیں رکھ پاتا' جو فنی لحاظ سے کمزوری ہے۔ لیکن چونکہ ناول کے واقعات اور حادثات کا بہاؤ بہت تیز ہے' اس لئے یہ فنی کمزوری گرفت میں نہیں آتی ہے۔

حقانی القاسمی

لم یات نظیرک: سیرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالیاتی بیانیہ

واحسنُ منک لم تر قط عینی　　واجمل منک لم تلد النسا،
خلقت مبرء من کل عیب　　کانک قد خلقت کما تشا،

شاعر رسول حضرت حسان بن ثابتؓ کے یہ اشعار جب بھی میں پڑھتا ہوں تو رسول اکرمؐ کا منوہر روپ، آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے اور ایک لمحے کیلئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اس دیار حبیب میں پہنچ گئے ہوں، جس کی گلیوں میں مشک وعنبر کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ عشق رسول میں ڈوبے ہوئے یہ وہ اشعار ہیں، جنہیں پڑھتے ہوئے آنکھوں کی زمین نم ہوجاتی ہے اور دل کا آسمان لاکھوں سورج، چاند، ستاروں سے جگمگانے لگتا ہے۔ رسول اکرمؐ کی مدحت کرنے والا، اپنے عشق اور اپنے باطن کا اظہار جب شعروں میں کرتا ہے تو جذب اور محویت کی ایک عجیب سی تقدیسی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور پورے وجود کے ارد گرد ایک نورانی ہالہ منور ہواٹھتا ہے۔ یہ رسول اکرمؐ کی ذات بابرکت کی کشش ہے کہ ان کی ذات میں کھوکر انسان اپنے آپ کو بھول بیٹھتا ہے اور اس کی سوچ میں رسول اللہ کی ذات کی خوشبو شامل ہوجاتی ہے۔

رسول کی مدحت ایک نسخہ کیمیا ہے۔ ذکر حبیب میں جو شفاء ہے، وہ کہیں بھی نہیں۔ امام بوصیری بہت بڑے عالم تھے، ایک بار ان پہ فالج کا حملہ ہوا، بہت علاج کرایا، کیسے کیسے مسیحا نفس اطباء سے رجوع کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ زندگی اداس، اجاڑ ہوگئی اور راستے تاریک۔ تبھی وہ بدر جو کبھی ثنیۃ الوداع سے طلوع ہوا تھا، ان کی آنکھوں کی گھاٹی میں اتر آیا اور امام بوصیری کو اس نورانی چہرے نے نسخہ شفاء عطا کردیا وہ ایسے صحت یاب ہوئے کہ دیکھنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ امام بوصیری پر قیامت کی کتنی ہولناک راتیں گزر چکی ہیں۔ انہوں نے 'قصیدۂ بردہ' لکھا اور اس قصیدے میں رسول اللہؐ سے اتنا کامل عشق تھا کہ وہ عشق شفاء میں بدل گیا...... شیخ سعدی کا واقعہ بھی بہت سے ذہنوں میں ہوگا کہ وہ ایک بار مدحت رسول میں مصرعے لکھ رہے تھے، تین مصرعے مکمل ہوچکے تھے، چوتھا مصرعہ ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ وہ مضطرب ہوکر باغات میں گھومنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگلا مصرعہ کیسا ہو، تبھی حضور کو انہوں نے خواب میں دیکھا، انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ شیخ کیا بات ہے؟ پریشان کیوں ہو؟ شیخ سعدی نے جواب دیا۔ تین مصرعے لکھ لئے ہیں، چوتھا مصرعہ نہیں لگ رہا ہے۔ آنحضرت نے کہا تین مصرعے سناؤ۔ شیخ سعدی نے وہ مصرعے سنائے ۔

بلغ العلی بکمالہ
کشف الدجی بجمالہ
حسنت جمع خصالہ

تو رسول اکرمؐ نے مسکرا کر کہا، اس میں کیا مشکل ہے۔ اگلا مصرعہ یوں پڑھو۔ **صلوا علیہ وآلہ**۔ یہ ہے عشق حبیب کا اثر۔ ہر خطے کے لوگوں نے نبی امی سرور کونین کو اپنے اپنے انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور ہر ایک میں عشق کی خوشبو تھی، محبت کا مشک وعنبر تھا۔ محسن کاکوروی نے جب نعت لکھی تو عشق کے وہ حوالے دیے، جو اپنی زمین کے تھے ۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل	برق کے کاندھے پر لاتی ہے صبا گنگا جل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی	کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
آتش گل کا دھواں بام فلک تک پہنچا	جم گیا منزل خورشید کی چھت میں کاجل

محسن کاکوروی کی اس نعت میں عشق کی علامتیں بندرابن، متھرا اور کاشی ہیں اور یہی عرب کی سرزمین میں جاکر مکہ مدینہ بن جاتی ہیں۔ یہ عشق آفاقی ہے اور اس عشق میں زمین اور جغرافیے کی کوئی قید نہیں۔ یہ تو عشق ہے سراپا عشق۔ عشق کی زبان ہی الگ ہوتی ہے۔

ہمارے دور کے شاعر عنبر بہرائچی نے عشق نامہ لکھا تو انہوں نے اپنی ہی زمین کے عشقیہ حوالے اور استعارے استعمال کئے اور اپنی ہی زمین کے حوالے سے عرب کی زمین کو پہچانا۔ 'لم یات نظیرک' عنبر بہرائچی کی ایسی کتاب ہے جس میں انہوں نے سنسکرت مہا کاویہ سے مدد لی اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ آدمی اپنے عشق کا اظہار اپنے ہی انداز سے کرے اور اپنی ہی زبان میں۔ 'لم یات نظیرک' میں عہد رسالت کی بزم ورزم کی اس طرح داستان لکھی گئی ہے کہ خیر القرون' آنکھوں میں ایک موجود لمحے کی طرح چمک اٹھتا ہے۔ آج جب کہ ہم حراء' ثور احد' ثنیات الوداع' طائف' کوہ ابوقبیس جبل الرماق، وادی قناۃ، جبل نور، داراءقم، شجرۃ الرضوان کو بھول گئے ہیں اور نہ جانے کتنے مقدس شہر' مقامات اور گلیاں ہیں جن سے ہماری ذہنی رشتے ختم ہوگئے ہیں۔ یہ کتاب پڑھ کر وہ رشتے بحال ہونے لگتے ہیں۔

ہمارا ذہن شاید فتح مکہ کا واقعہ بھی بھول گیا ہے۔ ذرا یاد کیجئے' اس واقعے کو اور سوچئے پیغمبر اسلام محمد العربیؐ المدنی کے اس عظیم کردار کے بارے میں جس نے دشمنوں کو بھی زیردست کرلیا۔ عنبر بہرائچی نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ۔

ہزار ہا مثال ہیں کہ فاتحوں نے کبر میں	سروں کے خوں چکاں منار جابہ جا کھڑے کئے
ضعیف وطفل وزن پہ ظلم کے پہاڑ توڑ کر	لگائے ہیں اجاڑ بستیوں میں خوب قہقہے
'مگر یہ فاتحِ عظیمؐ کس قدر ہے منکسر	نہیں کوئی نظیر پھر زماں کہاں سے لاسکے؟
یہ عجز کا کمال ہے ہر ایک شرط مان لی	حدیبیہ میں بھی نبیؐ نے مشرکین کے لئے

جو کھا گئے شکست ان پہ بھی ہے بارشِ کرم
بتاؤ کس ظفر مآب نے یہ فیصلے لئے؟

لبوں پہ اُنطُحیٰ کے اک شفق طلوع ہوگئی
ابو معاویہ نے خدشہ خفی جو وا کئے

کہا یہ صاحب الردا نے آج یوم لطف ہے
یہ دن ہے آج زندگی کے حسن انتظام کا

یہ دن ہے آج آدمی کے عز و احترام کا
یہ دن ہے آج بخشش و عطا و عفوِ عام کا

یہ دن ہے آج عظمتِ حرم کے اہتمام کا
یہ دن، درونِ کعبہ انتظام و انصرام کا

جو بو معاویہ کے گھر پناہ لے اسے اماں
جو اپنے اسلحوں کو دور پھینک دے اسے اماں

وہ جس کے جسم پر ہیں زخم لگ گئے اسے اماں
درِ مکان کرے جو بند خوف سے، اسے اماں

حدود مسجد حرم میں جو چھپے اسے اماں
جو مضطرب فضائے امن کے لئے اسے اماں

یہ تھا رسول اللہ کا انسانی منشور۔ یہ امن کا اعلانیہ تھا۔ رسول اللہ کی انسانیت پسندی کی ایک روشن مثال۔ اس طرح کے ہزاروں واقعات ہیں جو رسول اللہ کے عظیم کردار کے شاہد عدل ہیں۔ عنبر بہرائچی نے رسول اکرمؐ کی زندگی کے بہت سارے واقعات کو نظم کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور یہ یقیناً بہت نیک اور مقدس کام ہے۔ الوہی بارش میں بھیگ کر الفاظ کتنے مطہر و منور ہو گئے ہیں۔ تجنجل کی طرح خوبصورت، حسین الفاظ۔ ان میں بلا کی تاثیر ہے۔ یہ الفاظ زمیں کے نہیں، آسماں سے اترے ہوئے لگتے ہیں، جو اپنی روشن کرنوں سے ہمارے ذہن کی تاریکیوں کو اجال رہے ہیں۔ یہ ایسی تقدیسی شاعری ہے، جس میں عنبر بہرائچی کا باطن اور ان کا عشق ہویدا ہے۔

'لم یات نظیرک' ابن العربی، منصور حلاج، ورجل، ملٹن، ابن العربی اور کالی داس، ہیومر، فردوسی، والمیکی اور بیاس کا خوبصورت منتھن ہے۔ یہ کتاب دراصل وہ محبت نامہ ہے جو ہندوستان میں رہنے والے ایک شخص نے اپنے ہردے کے پنوں پر رقم کیا ہے اور اسے ہندوستانی جھالر عطا کیا ہے۔ مگر روح عرب کی ہے، مکہ مدینے کی ہے، وہاں کی گلیوں کی ہے، وہاں کی گھاٹیوں کی ہے، وہاں کے پہاڑوں کی ہے، غارِ حراء کی ہے، احد کی ہے، جبل ثور کی ہے، مدینے کی ہے، طائف کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ ہماری وہ مقدس یاترا مکمل ہو جاتی ہے جو پاؤں سے نہیں، آنکھوں سے کی جاتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے ہی سہی رسول اکرمؐ کی زندگی کو ہم اپنے سینے کی دھڑکنوں میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ 'لم یات' یقیناً ہمیں ورتمان سے ایسے اتیت میں لے جاتا ہے، جس میں ہمارا تابناک مستقبل مضمر ہے۔ جہاں سب کچھ روشن ہے۔ کوئی گرد نہیں، کوئی دھند نہیں، کوئی غبار نہیں، سب کچھ منور، سب کچھ ظاہر، سب کچھ باطن۔ 'لم یات' عنبر بہرائچی کے عشق باطن کی ایک سچی یاترا ہے، ایک مکمل پریم سادھنا۔ عنبر بھائی کو بہت بہت مبارک کہ انہوں نے ایک ایسی کتاب لکھی، جس کا لفظ لفظ چاند ستاروں کی طرح منور اور گلابوں کی طرح معطر ہے۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

''گائے'' جدیدیت کا علمبردار افسانہ

''گائے'' جدیدیت کے رجحان کا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس کے خالق انور سجاد ہیں۔ انور سجاد کا شمار جدیدیت کے علمبردار افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ 'گائے' ان کا مشہور افسانہ ہے۔

''گائے'' دو سطحوں پر کامیابی سے چلنے والی کہانی ہے۔ پہلی سطح تو عام سطح ہے۔ جس میں کہانی الفاظ کے ظاہری معنوی اشاروں کے بل بوتے آگے بڑھتی ہے' گائے اور گائے سے محبت کرنے والے انسان (نگا)' اور تیسرے دونوں کے مابین ولن Vilon کا کردار ادا کرنے والے' گھر کے افراد جس کی نمائندگی بابا کررہے ہیں۔ کہانی حیوانوں پر انسانوں کے ذریعہ ہونے والے ظالم کا اظہار بھی ہے اور اس کے خلاف احتجاج بھی۔ نگا احتجاج کی بلند آواز بن کر کہانی میں شروع ہی سے موجود ہوتا ہے۔ بے بس و لاچار نگا پہلے اپنے گھر والوں کو خوب سمجھاتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی ایک نہیں چلتی۔ ایک دو لمحے کو نگا خود کو مجبور و بے کس محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب ظلم حد تجاوز کرجاتا ہے اور گائے کو ٹرک میں لاد لیا جاتا ہے اور چلنے کی تیاری ہوجاتی ہے تو نگا تمام حدیں توڑ کر بابا کی بندوق اٹھالاتا ہے۔ انجام کچھ بھی ہوا ہو' گائے بوچڑ خانے گئی یا نہیں' نگا کی بندوق کا نشانہ' ٹرک ڈرائیور بنا یا بابا' اس سے قطع نظر کہانی نگا کو ظلم کے خلاف شدید ترین روپ اختیار کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔ ایک بے کس و مجبور انسان ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھالیتا ہے۔

> ''خدا معلوم نِگے کو کیا ہوا تھا۔ یکدم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آگیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہوگئے تھے اور دماغ بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر میں گیا تھا اور دیوار سے بابا کی دونالی بندوق اتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اسی جنون میں بھاگتا ہوا باہر آگیا تھا۔ کاندھے پر بندوق رکھ کے نشانہ باندھا تھا۔''

کہانی اپنی ظاہری سطح میں بھی زبردست کشش رکھتی ہے۔ گائے پر ہونے والے ظلم کو انور سجاد نے بڑی خوبصورتی سے قلم بند کیا ہے قاری کے دل میں گائے سے ہمدردی کا پیدا ہوجانا۔ کہانی کی کامیابی ہے۔

> ''اُن سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں۔ گائے کی ٹانگیں تھرکی تھیں' لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی۔ جب انہوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ پھر تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا۔ اور اس نے جما کر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی گائے پھر تختے کی طرف منہ کرکے سیدھی ہوگئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا ''آ وپیئو'' اور ان سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہہ برسایا تھا۔''

کہانی میں ظلم و ستم' انگریزوں کی یاد دلاتا ہے۔ یوں بھی کہانی دوسری سطح میں اپنے معنوں کے کئی Dimention رکھتی ہے۔ انور سجاد جیسے فنکار سے گائے' نگا اور ظالم گھر والوں کی سیدھی سادی کہانی کی امید نہیں کی جاتی۔ کہانی علامتوں کا لبادہ اوڑھے اپنے تاثرات میں وسیع منظرنامے رکھتی ہے۔ گائے کو ہم

جنگِ آزادی کے مظلوم عوام مان لیں تو پھر کہانی ایک نیا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ بابا' انگریز ظالم افسران کا کردار نبھاتے نظر آتے ہیں اور نِکّا ہماری سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ انگریز کے ظلم و ستم کے آگے عوام مجبور و بے کس تھے۔ جب جہاں' جس طرف وہ اپنی طاقت کے بل بوتے عوام کو لے جاتے' وہاں جانا ان کی مجبوری تھی۔ جب کبھی عوام نے اپنی ناراضگی یا عدم مرضی اظہار کیا' انگریزوں کے ظلم و ستم میں اضافہ ہوا۔ ہماری سیاسی جماعت جس میں کانگریس پارٹی (پہلے اکیلی جماعت تھی بعد میں مسلم لیگ بھی سامنے آئی) کا نام نمایاں تھا اکثر انگریزوں کے ظلم و ستم کیخلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھی۔ اور آخر میں آزادی کے متوالوں نے ظلم کیخلاف شدت اختیار کرتے ہوئے ہتھیار اٹھالئے Quit India جیسی تحریک کی شکل میں اپنے غصہ کا اظہار کیا۔ ''گائے'' کہانی میں علامتوں کو جتنے زاویوں سے دیکھیں گے' کہانی نئے منظر نامے پیش کریگی۔ اور یہ خوبی کہانی کو بڑا بناتی ہے۔ اب ہم کہانی کو تقسیم ہند کے پس منظر میں دیکھیں مظلوم و بے کس عوام کو سرحدی خطوط کے تابع کر کے تارک بننے پر مجبور کیا گیا۔ ان کے گھروں کو لوٹا گیا' سفر پر مجبور کیا گیا۔ دورانِ سفر بھی مظالم کی حد کردی گئی۔ امن کے پیغامبر خاموش کھڑے اپنی بے کسی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بالآخر مظلوموں (اپنے فرقے اور اپنے ملک) کی حفاظت کیلئے' امن کے علمبردار سامنے آئے اور ان کی حفاظت کی خاطر اقدام کئے گئے گائے پر ہونے والے ظلم و ستم' ہجرت کے کرب کی یاد دلاتا ہے۔ گائے کی بے کسی اور بار بار پیچھے مڑ کر اپنے بچھڑے کو دیکھنا' ان تاریکینِ وطن کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے اپنے کلیجوں پر پتھر رکھ کر' اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کی لیکن ہجرت کی اس گھڑی ان کی نگاہیں بار بار اپنے گھر بار کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

''جانے گائے کو کیا سوجھی تھی پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی نِکّے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گذر گئی تھی۔

نِکّا۔ جسم کا مفلوج حصہ۔ دیکھو' دیکھو وہ تو بائیں طرف۔ ایک چونکا تھا۔

''قدرتی بات ہے'' بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔''

کہانی میں کئی بار افسانہ نگار نے نِکّا کی عزت نفس پر شدید طنز کر کے اس کے اندر کے خوابیدہ انسان کو جگانے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے انہیں طنزیات کے نشتروں نے نِکّا کو ہتھیار اٹھانے پر آمادہ کیا ہے۔

''اور دھول اڑاتی نِکّے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گذر گئی تھی۔

نِکّا۔ جسم کا مفلوج حصہ۔

نِکّا۔ مفلوج وجود''

یہ اور اس طرح کے دوسرے جملے مثلاً اس کی بے بسی پر گھر والوں کے (ظلم و ستم کرنے والوں) قہقہے نِکّا جیسے لاچار شخص کو احتجاج کا سلگتا وجود بنادیتے ہیں۔ گائے انور سجاد کی ایک بہت اچھی کہانی ہے جو ایک طرف قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور دوسری طرف سماجی مسائل کی خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔

سرور کریم

محمد سالم کی تنقید: مدّاحی یا احتساب

''شمس الرحمٰن فاروقی شعر، غیر شعر اور نثر کی روشنی میں'' ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مقیم محمد سالم کی دوسری تنقیدی کتاب ہے۔ اس سے قبل ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''زاویۂ خیال'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ ''زاویۂ خیال'' میں محمد سالم کے کئی بے حد اہم مضامین شامل ہیں۔ خصوصاً جدید شاعری کے تعلق سے انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے نہ صرف جدید شاعری پر ان کی بھرپور گرفت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس سے ان کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

''شعر، غیر شعر اور نثر'' شمس الرحمٰن فاروقی کی ہی نہیں بلکہ جدید اردو تنقید کی بھی ایک بیحد اہم کتاب ہے۔ جس میں شعر و ادب کے متعلق بعض بنیادی نکات پر پہلی بار تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اردو ادبی حلقے میں اس کتاب کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ اور مختلف لوگوں نے اس کتاب کے سلسلے میں اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس کتاب کی اہمیت اس بات کی متقاضی تھی کہ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔ اس تقاضے کا حق پہلی بار محمد سالم نے ادا کیا ہے۔ محمد سالم کا یہ تفصیلی مضمون جب ''توازن'' میں شائع ہوا تو فاروقی نے ان کے نام ایک خط لکھ کر اس مضمون کے گرانقدر ہونے کا اعتراف کیا اور لکھا۔ ''شاید پہلی بار کسی صاحب نظر نے 'شعر، غیر شعر اور نثر' پر اتنی غائر نظر ڈالی ہے۔'' لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا۔ ''لیکن آپ نے نکتہ چینی بہت کم کی ہے یقین ہے کہ اختلاف کے اور پہلو بھی نکلتے اگر آپ کڑا احتساب کرتے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی کے خط کے ان الفاظ نے ایک غلط فہمی کے لئے فضا ہموار کر دی کہ محمد سالم نے اپنی کتاب میں فاروقی کا احتساب نہیں کیا۔ کتاب پر شائع ہونے والے تبصروں میں بھی اس خیال کی دھند چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ محمد سالم دراصل ایک باذوق قاری ہیں۔ جنہوں نے شعر، غیر شعر اور نثر کے مضامین کی بے پناہ اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے مذکورہ کتاب کے سلسلے میں اپنے مطالعے و محسوسات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ موصوف نے مدلل مداحی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ کتاب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں کہیں بھی فاروقی کے خیالات سے محمد سالم کو جزوی یا کلی طور پر اختلاف ہے یا جو باتیں شعر و ادب کے تعلق سے

مزید وضاحت طلب ہیں یا فاروقی کی جن رایوں کو من وعن قبول کرلیا جائے تو ادب کے کلاسیکی سرمایے کے ایک قابل قدر حصے کی نفی ہو جائے گی۔ وہاں موصوف نے فاروقی کی تنقید پر اپنی دو ٹوک رائے کا اظہار کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ فاروقی ہمارے عہد کے ایک رجحان ساز اور نظریہ ساز ناقد ہیں۔ جن کی آراء شعر وادب کے متعلق مستند اور معتبر ہی نہیں سمجھی جاتی بلکہ دستاویزی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ اس تناظر میں فاروقی کی تنقید کا ''کڑا احتساب'' وہی شخص کرسکتا ہے جو ان کے نظریات کو رد کر کے اس کے بالمقابل نئے نظریات وضع کرسکے۔ ظاہر ہے محمد سالم نظریہ ساز ناقد نہیں ہیں بلکہ وہ تو ایک ادب شناس قاری ہیں اور ادبی مطالعے کے تحت ان کے جو محسوسات و تاثرات ہوتے ہیں، ان کا اظہار بھی انہوں نے شعری مجموعے ''صبائے سنگ'' کے توسط سے پیش کیا ہے۔ فاروقی کے شعریات سے متعلق مضامین کا جائزہ لیتے وقت موصوف کا شعری مذاق بھی بخوبی نمایاں ہوا ہے۔ مثلاً فاروقی نے ایسے موزوں کلام جس میں اجمال کے ساتھ برجستگی، سلاست، روانی اور بے تکلفی طنز وغیرہ عناصر کی شمولیت ہو، کو غیر شعر قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سوؔز اور مجذوبؔ کے اشعار بطور مثال پیش کئے ہیں۔ سالم صاحب فاروقی کی اس رائے سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر فاروقی کے اس خیال کو معیار مان لیا جائے تو اردو شاعری کے کلاسیکی سرمایے کا ایک معتد بہ حصہ شاعری کے زمرے سے خارج ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالب کے چند اشعار بطور مثال پیش کیا ہے۔

عشق نے غالب نکما کردیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اسی قبیل کے کئی اور اشعار انہوں نے درج کئے ہیں جو سہل ممتنع کا نمونہ ہیں۔ لیکن اگر انہیں فاروقی کے بیان کردہ معیار پر پرکھا جائے تو یقیناً ان اشعار کو غیر شعر کہہ کر قربان کردینا پڑیگا۔ یہاں پر موصوف نے کلیم الدین احمد کا حوالہ دیا ہے۔ جنہوں نے غزل کی مخالفت کے باوجود ان اشعار کی سادگی اور دلپذیری کو تسلیم کیا ہے۔ محمد سالم نے یہ سوال بھی قائم کیا ہے کہ کیا فاروقی غالبؔ کے ایسے اشعار کو سوز اور مجذوبؔ کے مذکورہ شعروں کی صف میں رکھنا پسند کریں گے؟ اس اختلاف سے قطع نظر فاروقی کے مضمون 'شعر' غیر شعر اور نثر' کی بے پناہ اہمیت کو سالم صاحب نے تسلیم کیا ہے۔ اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ فاروقی نے شعر غیر شعر اور نثر کے امتیازات کے متعلق جو

نتائج اخذ کیے ہیں، جدید تنقید کے باب میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ''مطالعۂ اسلوب کا ایک سبق'' کے تجزیے میں محمد سالم نے فاروقی کے اس خیال کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ ''موضوع کی خوبی کا شعر کی خوبی سے براہ راست تعلق نہیں ہے اور اسلوب کو معیار بنا کر ہی اچھے بُرے کا حکم لگایا جا سکتا ہے'' یہاں محمد سالم نے ایک اہم اور فکر انگیز نکتہ اٹھایا ہے کہ ''اگر موضوع بدصورت اور کریہہ منظر ہے اور اسے خوبصورت فنی لباس پہنایا گیا ہو تو اس کی حقیقی معنوی حیثیت کیا ہوگی؟'' حالانکہ سالم صاحب یہ اعتراف کرتے ہیں کہ فاروقی نے اپنے ایک اور مضمون 'ادب کے غیر ادبی معیار' میں اس نکتے کے متعلق موہوم اشارے کیے ہیں۔ انہوں نے فاروقی کا اقتباس درج کیا ہے۔ ''اگر کسی تحریر میں کمینگی، بے انصافی، ہلاکت خیزی، خود غرضی، ظلم و تعدی کا برملا اظہار ہے تو اس تحریری سے آپ اخلاقی طور پر نفرت کر سکتے ہیں۔ میں بھی کرتا ہوں اور کروں گا، لیکن اگر اس میں شاعرانہ صفات ہیں تو اسے شاعری ماننے کے سوا چارہ نہیں۔'' سالم صاحب نے فاروقی کے اس تشنہ بیان کی وضاحت چاہی ہے کہ کمینگی کی حامل شاعری کی انفرادی اور کائناتی معنویت کیا ہوگی؟ موصوف نے یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ۔ ''دنیا میں وہ کون ایسا شاعر ہے جو رکیک اور مبتذل اشعار کے صرف اسلوبیاتی حُسن کے بل بوتے پر بڑا شاعر بن گیا ہے۔'' ''پانچ ہم عصر شاعر'' میں محمد سالم نے خاص طور پر وزیر آغا کے سلسلے میں فاروقی کی تنقید کے اس پہلو کی جانب توجہ دلائی ہے، جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ وزیر آغا کی نظموں اور ان کے عنوانات میں جو الفاظ بار بار مستعمل ہوئے ہیں۔ ان میں ہر جگہ علامتی مفہوم ڈھونڈنا ممکن نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ۔ ''ایک ہی دو علامتوں کا بار بار استعمال شاعر کی خلاقانہ شان کے منافی ہے'' فاروقی نے وزیر آغا کے مجموعے ''دن کا زرد پہاڑ'' کے تجزیے سے یہ رائے قائم کی ہے کہ ان کی وہی نظمیں کامیاب ہیں جن میں ایسے کلیدی الفاظ مثلاً رات دن، اندھیرا صبح دھوپ وغیرہ شروع میں نہیں آئے ہیں۔ سالم صاحب نے فاروقی کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے وزیر آغا کی ان نظموں کو موضوع بحث بنایا ہے، جنہیں فاروقی نے مذکورہ عناصر کی وجہ سے وزیر آغا کی کمزور نظمیں قرار دیا ہے۔ محمد سالم نے چار نظموں کے چار ایسے مصرعوں کو پیش کیا ہے جن میں لفظ رات کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہاں ہر مصرعے میں رات کی کیفیتوں کا اظہار مختلف ہے۔ سالم صاحب کی رائے میں معنی میں توسیع کا عمل اگر رک جائے تو یہ بات قابل

گرفت ہے لیکن وزیر آغا کے یہاں ان مصرعوں میں معنی کی توسیع کا عمل جاری رہتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ان نظموں میں ان کلیدی الفاظ کا ان کے سیاق وسباق میں علامتی مفہوم اخذ کرنا ناممکن نہیں۔ موصوف کی رائے میں: ''کوئی شاعر اپنی جمالیاتی بصیرت کے زیر اثر کسی مخصوص علامت کو بار بار اس کے تلازمی مفہوم میں استعمال کرتا ہے تو یہ خوبی ہے'' یہاں انہوں نے وزیر آغا کی ایسی بیشتر نظموں جنہیں فاروقی کمزور نظموں کے زمرے میں رکھتے ہیں' کو معنوی اعتبار سے کامیاب نظمیں قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے نظم ''کوہ ندا'' کا تجزیہ کرکے اپنی بات ثابت بھی کی ہے۔ ییٹس' اقبال اور ایلیٹ کے موازنے میں محمد سالم نے فاروقی کے اس جملے کی سخت گرفت کی ہے۔ ''ییٹس' اگر یہ نظم (ذوق وشوق) پڑھ لیتا تو ملارمے کا کلمہ بھول جاتا'' موصوف کے خیال میں اقبال کی خوبیوں کے بیان میں فاروقی کے انداز میں جذباتی رنگ نمایاں ہوجاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''بہ باطن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی ییٹس اور ایلیٹ کو سامنے رکھ کر قارئین پر اقبال کی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں۔''

ان کے علاوہ بھی اس کتاب میں کئی ایسے مقامات آتے ہیں جہاں سالم صاحب فاروقی کے خیالات سے جزوی اختلافات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کہیں تو ان کا اختلاف برائے اختلاف ہی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً فاروقی نے جن اشعار کے حوالے سے ندا فاضلی کی شاعرانہ معنویت سے بحث کی ہے ان میں سے چند اشعار میں محمد سالم کے خیال میں ''کو'' کا استعمال غیر فصیح ہے اور فاروقی نے اس کی جانب اشارہ نہیں کیا ہے۔ اسی طرح فاروقی کا یہ اعتراف کہ غالب اردو کے غالباً سب سے بڑے شاعر تھے' کے سلسلے میں موصوف کہتے ہیں کہ فاروقی کو اس بات کے ثبوت میں ان معتبر ناقدین کا حوالہ دینا چاہئے تھا جنہوں نے غالب کو اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔

محمد سالم کا فاروقی کی تنقیدی آراء سے کلی طور پر اختلاف ان مضامین کے ذیل میں نمایاں ہوا ہے جن میں فاروقی نے افسانے کی صنفی حیثیت سے بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فاروقی نے اپنے ان مضامین میں کلیم الدین احمد کی طرح ایک سنسنی خیز تجربہ کرنا چاہا ہے۔ موصوف نے مزید اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح کلیم الدین احمد غزل کی مخالفت کے باوجود اس کی جڑ کو نہیں کاٹ سکے۔ اسی طرح فاروقی کے یہ مضامین بھی افسانے کی قدر و قیمت اور اس کے ارتقاء پر اثر انداز نہیں ہو پائے۔ محمد سالم نے افسانے کے متعلق فاروقی کے تمام اعتراضات پر تفصیلی

گفتگو کی ہے اور اس سلسلے میں وارث علوی، فضیل جعفری اور وہاب اشرفی وغیرہ جیسے ناقدین کے خیالات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ جو فاروقی کے انہی اعتراضات کے جواب میں تحریر کئے گئے تھے ان مضامین کے تجزیئے میں سالم صاحب نے تقابلی طریقہ کار کو بدلا ہے۔ اس موازنے اور مقابلے میں موصوف کا نہ صرف صحت منداور معروضی نقطۂ نظر ابھر کر سامنے آیا ہے بلکہ تنقیدی منظر نامے پر ان کی گہری نظر کا بھی بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ افسانے کے سلسلے میں فاروقی کے بیشتر اعتراضات کو محمد سالم نے مختلف ناقدین کے حوالے سے رد کیا ہے۔

ان اختلافات سے قطع نظر محمد سالم فاروقی کے ناقدانہ مرتبے کے معترف ہیں موصوف نے جا بجا فاروقی کے تنقیدی نظریات اور ان کی ناقدانہ بصیرت کا اعتراف کیا ہے۔ کتاب کی ابتدا ہی انہوں نے ان الفاظ میں کی۔ ''شمس الرحمٰن فاروقی ایک جید نقاد ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقیدی بصیرت سے نہ صرف شعری، ادبی اور جمالیاتی سطح پر نت نئے شعری نکات کا انکشاف کیا ہے بلکہ تنقید کی نئی راہوں سے ہمیں روشناس بھی کرایا ہے۔'' ایک جگہ اور لکھتے ہیں: ''شعری تنقید کے باب میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''شعر غیر شعر اور نثر'' کے علاوہ اگر وہ کچھ بھی تصنیف نہ کرتے پھر بھی اردو تنقید میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہتا۔'' محمد سالم نے خاص طور پر فاروقی کے استدلالی انداز بیان کو سراہا ہے۔ لکھتے ہیں: ''فاروقی کی زبان تنقید کی زبان ہے۔ ان کی استدلالی گفتگو میں انتہائی شائستگی ہوتی ہے۔ کسی بھی موضوع پر وہ بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ متوازن انداز میں اس کے ہر ممکن پہلو پر مفکرانہ بحث کرتے ہوئے نتائج تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے علم، مفکرانہ تفکر، تدبر، استدلال اور Arguments کے ذریعہ بیش بہا تنقیدی خدمات انجام دی ہیں۔''

محمد سالم کے اس مطالعے کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ فاروقی جیسے قدر آور ناقد کے افکار و نظریات سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے کہیں مرعوبیت کا اظہار نہیں کیا ہے۔ موصوف کا یہ مطالعہ نہ تو فاروقی کی مدلل مداحی ہے اور نہ ہی اختلافات کا پشتارہ، بلکہ یہ ایک بالغ نظر ادیب کا اردو تنقید کی ایک بے حد اہم کتاب کا ایک معروضی مطالعہ ہے اس تجزیئے کی روشنی میں فاروقی کی نکتہ چینی یا احتساب سے متعلق محلولہ بالا رائے کو ان کی انکساری پر تو محمول کیا جا سکتا ہے، محمد سالم کی تنقید کا میزان نہیں مانا جا سکتا، بڑے ناقد کا کوئی سرسری بیان بھی ادب کی دنیا میں کیسی فضا تعمیر کرتا ہے، اس حقیقت کی بھی یہ ایک زندہ مثال ہے۔

پروفیسر محمد مطیع الرحمن

قبر حضرت ایوب علیہ السلام

اتوار ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء (۱۱ جمادی الآخر ۱۴۱۳ء) کو کانگریس پارٹی کے لیڈر وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے دور وزارت میں راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے تربیت یافتہ کارسیوکوں نے اپنے رہنماؤں کی قیادت میں اجودھیا ضلع فیض آباد کی ۴۶۴ سالہ تاریخی بابری مسجد کو شہید کر دیا۔ اس کے فوراً بعد مہاراشٹر، گجرات، راجستھان اور اتر پردیش کے مختلف مقامات پر مسجد کی شہادت پر پُرامن طور پر احتجاج کرنے والوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ بڑی تباہی اور بربادی ہوئی۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے ☆ گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

آزاد ہندوستان کے اس سانحۂ عظیم سے متاثر ہو کر سی۔ ایم۔ کالج دربھنگا کے پروفیسر اور حساس شاعر منصور عمر نے ایک نہایت ہی درد انگیز نظم ''ابابیل'' لکھی جو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کے دل کی آواز ہے۔ منصور عمر کی اس نظم پر میں نے تبصرہ لکھا جو سہ ماہی ''تمثیل نو'' دربھنگہ کے دوسرے شمارہ جون تا اگست ۲۰۰۱ء میں ''سانحۂ بابری مسجد اور منصور عمر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ جسے بہت سے لوگوں نے اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کی صحیح ترجمانی سمجھ کر پسند کیا۔

تبصرہ میں شہر اودھ یعنی اجودھیا کی تاریخی اہمیت کا نہایت مختصر طور پر ذکر کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ ''یہاں مٹی کے دو بڑے اور اونچے ٹیلوں کے درمیان حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کے مزارات ہیں۔ یہاں کوتوالی کے پاس حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے ہند بن حام بن نوحؑ کا مزار ہے جو نوگزی کے نام سے مشہور ہے۔''

اس تبصرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد جمشید پور کے جناب شمس فریدی نے ''تمثیل نو'' کے ایڈیٹر جناب امام اعظم کو ۱۸ ستمبر ۲۰۰۱ء کو خط لکھا جو ان کو ۲۴ ستمبر کو ملا۔ اس خط کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

''تمثیل نو'' کے پچھلے شمارہ (جون تا اگست) میں پروفیسر مطیع الرحمٰن کا مضمون ''سانحۂ بابری مسجد اور منصور عمر'' پڑھ کر میں حیران و پریشان ہو گیا ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فیض آباد سے سات کیلومیٹر شمال مشرق میں دریائے گھاگرا (سرجو) کے کنارے اور مغل سرائے سے ۲۰۶ کیلومیٹر اتر پچھم اور لکھنؤ سے ۱۳۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کے

مزارات موجود ہیں۔

میری حیرانی اس لئے بڑھ گئی کہ یہ اطلاع یا معلومات انہیں کن ذرائع سے ہوئی؟ جبکہ حضرت ایوب علیہ السلام کا مقبرہ سلطنت عمان کے ایک قبائلی علاقہ (جواب ایک خوبصورت شہر بن چکا ہے) سلالہ کے قریب ایک پہاڑی پر موجود ہے۔ یہاں ایک جھرنا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس جھرنے کے پانی سے حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کیا تھا۔ آج بھی زائرین وہاں نہاتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جھرنے کا پانی جلدی امراض سے شفا بخشتا ہے۔ یہ تو ہے آنکھوں دیکھا حال جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ تقریباً ۲۳ سال میں عمان میں رہ چکا ہوں۔ رہی بات حضرت شیث علیہ السلام کے مزار کی تو واللہ اعلم بالصواب'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ دو ہزار سال اور آج سے تقریباً ساڑھے تین' چار ہزار سال قبل کے واقعات اور واقعات سے وابستہ مقامات کی تاریخی حقائق کی روشنی میں صحیح اور قطعی تعین بہت ہی پیچیدہ مسئلہ اور نہایت ہی مشکل کام ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ' مورخین تاریخ قدیم۔ تورات مقدس اور قرآن حکیم کے مفسرین' محدثین اور محققین اسلام' ماہرین عمرانیات اور نسل انسانی نے دنیا کی اہم مذہبی اور الہامی کتابوں اور عام روایات کی روشنی میں تاریخ عالم کے بہت سے اہم مقامات کی تعین اور نشان دہی کی کوشش کی ہے اور کہیں کہیں ان کو کامیابی بھی ہوئی ہے جیسے (۱) عراق عرب میں فرات کے مغربی کنارے پر کلدانیہ کا دارالحکومت شہر ''اُر'' (Ur) جہاں نمرود کی بادشاہت تھی اور جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی آزمائش کا واقعہ پیش آیا تھا اور اللہ کے حکم سے آگ کا الاؤ گلزار میں تبدیل ہو گیا تھا۔ (۲) مغربی اتر پردیش کے ضلع میرٹھ کی موانا تحصیل میں گنگا کی ایک قدیم دھار کے پاس ہستناپور کا شہر جہاں آریائی قوم کے کورو اور پانڈو راجاؤں کا دارالحکومت تھا۔ (۳) ہریانہ کے سابق کرنال ضلع میں تھانیسر کے پاس کروک شیتر' جہاں کورو اور پانڈو راجاؤں میں مہابھارت کی شدید جنگ ہوئی تھی جس میں آریائی قوم کے کبر و نخوت کو توڑنے کے لئے جناب کرشن نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ (۴) فلسطین کا شہر یروشلم جہاں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا دارالحکومت تھا اور جہاں یہودیوں کا مقدس مقام ہیکل سلیمانی تھا (۵) اور یروشلم سے تقریباً بارہ کیلومیٹر دکھن کوہ ساطیر پر بیت اللحم جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔

قدیم اور ماقبل تاریخ کے اہم مقامات کے سلسلہ میں روایات کی بھی کچھ اہمیت ہے۔ یہ

خیال کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا مزار شہر اودھ یعنی اجودھیا ضلع فیض آباد میں مٹی کے دو ٹیلوں کے درمیان حضرت شیث علیہ السلام کے مزار کے پاس ہے یا ان کا مزار جزیرہ نمائے عرب کی مملکت عمان میں سلالہ کے پاس ایک پہاڑی پر موجود ہے جہاں پانی کا ایک چشمہ ہے جس میں غسل کرنے سے جلدی امراض کے مریضوں کو شفا ہوتی ہے۔

دنیا کے بہت سارے مقامات پر ایسے چشمے موجود ہیں جن کے پانی میں کچھ ایسے معدنی اجزاء شامل ہیں جن سے جلدی امراض کو شفاء ہوتی ہے۔ جیسے راج گیر ضلع نالندا کے پہاڑی چشموں میں مخدوم کنڈ اور برہم کنڈ اور نواح مونگیر میں سیتا کنڈ اور ریاست مغربی بنگال کے ضلع بیر بھوم میں دو براج پور کے پاس گرم پانی کا چشمہ۔ بہت سارے مقامات پر گرم پانی کے ایسے چشموں کی اہمیت بڑھانے کے لئے اس سے کسی مذہبی ہستی کا نام وابستہ کر دیتے ہیں۔

لیکن اجودھیا ضلع فیض آباد اور سلالہ مملکت عمان دونوں مقامات میں حضرت ایوب علیہ السلام کے مزار کی موجودگی محض روایات پر مبنی ہے اور کوئی ایسا قابل تعین تاریخی ثبوت یا شک وشبہہ سے بالاتر ناقابل تردید مذہبی شہادت موجود نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا مزار اجودھیا ضلع فیض آباد ہی میں ہے یا مملکت عمان میں سلالہ کے پاس پہاڑی پر۔ لیکن حضرت ایوب علیہ السلام کے عرب مستعربہ میں ہونے' حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد بنی ادوم میں ہونے' ان کی والدہ اور ان کی اہلیہ کا بنی اسرائیل میں سے ہونے' سلالہ کے جذیرہ نمائے عرب میں ہونے اور اس کے پاس ایک پہاڑی پر چشمہ ہونے کے سبب مزار حضرت ایوب علیہ السلام کا' اجودھیا کے مقابلہ سلالہ کے پہاڑی علاقہ' میں ہونے کے قرائن بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا مزار وہیں ہو۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا مزار ان دونوں مقامات کے علاوہ کہیں تیسرے مقام پر ہو جس کا ہم لوگوں کو پتہ نہیں ہے تورات اور قرآن حکیم دونوں اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہے۔

اجودھیا ضلع فیض آباد۔ میں نے جن روایات اور شواہد کی روشنی میں شہر اودھ یعنی اجودھیا ضلع فیض آباد میں مٹی کے دو بڑے ٹیلوں کے درمیان حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کے مزارات کے بارے میں تحریر کیا تھا اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ا۔ امپریل گزیٹر آف انڈیا۔ یہ کتاب سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا (وزیر ہند) کے زیر

اہتمام کلارنڈن پریس اوکسفورڈ میں طبع ہو کر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کی کل ۲۶ جلدیں ہیں۔ جلد پنجم جس میں ایازئی سے آرکاٹ تک کا ذکر ہے۔ اس کے صفحہ ۵۷۱ پر اجودھیا کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

''سنسکرت میں اسے اجودھیا کہتے ہیں۔ صوبہ متحدہ کے فیض آباد ضلع کا ایک شہر جو ۴۸۔۲۶ شمال اور ۱۲۔۸۲ مشرق پر گھاگرا ندی کے دائیں کنارے پر اور اودھ روہل کھنڈ ریلوے پر واقع ہے۔ آبادی ۲۱،۵۸۶ ہے۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پرانا شہر بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اور اس کی یادگار میں کچھ اونچے ٹیلے باقی رہ گئے ہیں...... دہلی کے مسلمان سلاطین کے زمانہ میں اجودھیا یا اودھ صوبائی گورنر کا صدر مقام تھا...... بابری مسجد کے علاوہ اجودھیا میں دو اور ویران مسجدیں ہیں...... اجودھیا میں تین قبریں ہیں جن کا مسلمان بہت احترام کرتے ہیں۔ ایک نوح علیہ السلام کی۔ دوسری شیث علیہ السلام کی اور تیسری ایوبؑ کی۔ آئین اکبری میں شیث علیہ السلام اور ایوب علیہ السلام کے مزارات کا ذکر ہے۔ اس کے قریب ایک بڑا ٹیلہ ہے جس کو منی پربت کہتے ہیں...... قیاس غالب ہے کہ اس میں بودھوں کا ویران استوپ ہے...... اجودھیا فیض آباد میونسپلٹی میں شامل ہے''

۲۔ فیض آباد ڈسٹرکٹ گزیٹر۔ یونائیٹڈ پروونسیز آف آگرہ اور اودھ کے ضلع فیض آباد کا ڈسٹرکٹ گزیٹر جناب ایچ۔ آر۔ نیویل آئی۔ سی۔ ایس نے تحریر کیا۔ اور ضلع گزیٹرس کی یہ ۴۳ ویں جلد ۱۹۰۵ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی۔ اس کے صفحہ ۱۷۱ سے صفحہ ۱۷۵ تک وہ اجودھیا کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''اجودھیا۔ پرگنہ حویلی اودھ، تحصیل فیض آباد' گھاگرا یا سرجو کے دائیں کنارے پر پرانا شہر ۴۸۔۲۶ شمال اور ۱۳۔۸۲ مشرق پر واقع ہے۔ فیض آباد سے چار میل اتر پورب ہے۔ پختہ سڑک سے ملا ہوا ہے۔ انو پالی سے اجودھیا گھاٹ تک ایک برانچ لائن جاتی ہے۔ شہر سے ڈیڑھ میل دکھن ریلوے اسٹیشن ہے...... منی پربت کے پاس دو قبریں ہیں جن کو شیث علیہ السلام (Seth) اور ایوب علیہ السلام (Job) کی قبریں مانا جاتا ہے۔ آئین اکبری میں ان کا ذکر ہے اور ان کو بالترتیب چھ اور سات گز لمبی قبریں لکھا ہے۔ آرائش محفل میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔ کرنل ولفورڈ نے لکھا ہے کہ تھانہ کے پاس نوح علیہ السلام کی قبر ہے۔''

۳۔ گم گشتہ حالات اجودھیا (اودھ) یعنی تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیا۔ یہ کتاب اجودھیا کے ایک بزرگ جناب مولوی عبدالکریم صاحب نے فارسی میں لکھی تھی (ان کا ذی الحجہ ۱۳۰۸ھ یعنی ۱۸۹۰ء میں انتقال ہوا۔ ان کے پوتے مولوی عبدالقادر صاحب اجودھیا کی جامع مسجد بابری کے امام

تھے۔ ان کا اپریل ۱۹۳۰ء میں انتقال ہوا۔ مولوی عبدالکریم صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالرحیم صاحب نے بابری مسجد کی حفاظت کے سلسلہ میں مولوی امیر علی امیٹھوی کے ساتھ جہاد میں شرکت کی اور ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۵ء میں شہید ہوئے) مولوی عبدالقادر صاحب کے بیٹے مولوی عبدالغفار صاحب نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور حواشی کا اضافہ کر کے حسن برقی پریس گولہ گنج لکھنؤ سے شائع کیا۔ اس وقت کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے تھی۔ کتاب کا سال طباعت درج نہیں ہے۔ اس کتاب میں صفحہ ۱۶ سے صفحہ ۲۳ تک حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کی قبروں کا ذکر ہے۔

آئین اکبری میں مذکور ہے کہ قبر حضرت شیث علیہ السلام خطہ اودھ میں اور عجائب القصص جس میں حال انبیاء علیہم السلام مذکور ہے جس کا ترجمہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب دہلوی نے کیا ہے اور جب کا نام ترجمہ طاہرہ عجائب القصص رکھا ہے۔ اور جو مطبع دہلی میں چھپی۔ اصل اور ترجمہ دونوں میں ذکر حضرت شیث علیہ السلام ہے۔ اور ہونا ملک ہند خطہ اودھ میں مذکور ہے۔ اور اسے اکثر تواریخ مثل سیر المتاخرین و تاریخ مہر نیم روز اسد اللہ خاں غالبؔ وغیرہ میں دیکھا گیا ہے اور گلزار ابرار میں کہ ذکر میں اولیائے کرام کے لئے مذکور ہے۔ اسی احاطہ درگاہ حضرت شیث علیہ السلام میں جانب مشرق میں ایک قبر دراز ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام کی قبر مشہور ہے۔ واللہ اعلم بالصواب''

''خلاصۃ الاحادیث۔ من تالیف حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ۔ یہ کتاب مولوی نجف علی صاحب سہارنپور کے کتب خانہ میں تھی۔ مولوی نجف علی صاحب موصوف ملک اودھ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے عہدہ پر مامور تھے۔ اس کتاب کے الجزالاوّل باب ۱۱۹ صفحہ ۲۷۶ پر حکایات اور حالات .... مختلف عنوان کے تحت حسب ذیل عبارت درج ہے۔

قال علیہ السلام ان فی الہند بلدۃ اسمہا اودھ بین التلین قبرتین شیث وایوب علیہ السلام یعنی فرمایا حضرت علیہ السلام نے کہ تحقیق ملک ہند میں ایک شہر جس کا نام اودھ ہے۔ اس کے دو ٹیلوں کے درمیان دو نبیوں حضرت شیث اور حضرت ایوب علیہم السلام کی قبریں ہیں۔

''سراج الہدایہ۔ ترجمہ: در ہند شہر یست کہ او را اودھ گو بند۔ میان دو بلندی قبر دو پیغمبر یعنی شیث وایوب علیہ السلام۔ مطبع نصرت المطابع دہلی۔ از تصنیفات مولوی سید ناصر الدین محمد ابوالمنصور صاحب ص ۳۸۹۔ ۳۹۰......''

"......... آئین اکبری میں بھی حضرت ایوب علیہ السلام اور شیث علیہ السلام کی قبروں کا تذکرہ موجود ہے۔ علاوہ بریں یہ مضمون تاریخ کاشغی و ناسخ التواریخ و خلاصۃ الوقائع تصنیف قاضی شہاب الدین صاحب دولت آبادی جون پوری و جامع تواریخ و مجاہد الابرار اور محمد باقر مجلسی و خلاصۃ التواریخ و گلزار ابرار و سیر المتاخرین و مہر نیم روز اسد اللہ خاں غالب موجود ہے"

۴۔ اسرار حقیقت۔ اجودھیا ضلع فیض آباد کے جناب پچھمی نارائن کایستھ سری واستو پنشنر نے ایک کتاب 'اسرار حقیقت یعنی اجودھیا میں اسلامی نظارہ' لکھی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار لکشمی پریس گونڈا میں طبع ہو کر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ دوسری بار یہ کتاب ۱۹۶۶ء میں خواجہ پریس دہلی ۶ میں طبع ہوئی اور کتب خانہ نذیریہ۔ مسلم منزل' کھاری باؤلی دہلی ۶ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۹ اور ص ۲۰ پر لکھا ہے۔ "حضرت ایوب علیہ السلام: حضرت شیث علیہ السلام کے مزار کے متصل پورب جانب احاطہ ہی کے اندر ایک قبر حضرت ایوب علیہ السلام کے نام سے مشہور ہے۔ کتاب خلاصۃ الاحادیث جو کہ شہر سہارنپور میں مولوی نجف علی صاحب کے کتب خانہ میں قلمی موجود ہے۔ اس کے باب ۱۱۹ میں یہ حدیث مندرج ہے.......... ترجمہ حدیث۔ ہند میں ایک شہر ہے کہ اسے اودھ کہتے ہیں۔ اس میں درمیانی دو بلندی کے قبر دو پیغمبروں کی ہے۔ شیث و ایوب علیہ السلام۔"

....

جناب شمس فرید صاحب نے اپنے خط میں یہ نہیں لکھا کہ وہ کون سا پہاڑی مقام ہے جہاں ایک چشمہ اور حضرت ایوب علیہ السلام کی قبر ہے۔ وہ قبر ساحلی شہر سلالہ سے کس سمت میں اور کتنے فاصلہ پر ہے۔ ان کے خط سے یہ تو معلوم ہوا کہ ہندوستان کی طرح وہاں بھی ایک روایت ہے کہ ایک پہاڑی چشمہ کے قریب حضرت ایوب علیہ السلام کی قبر ہے اور اس پہاڑی چشمہ کے پانی سے غسل کرنے پر لوگوں کی جلدی بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ اگر شمس فرید صاحب مملکت عمان میں سلالہ کے قریب اس پہاڑی مقام کی نشان دہی کرتے تو لوگوں کی واقفیت میں اضافہ ہوتا۔

ہندوستانی مسلمانوں میں عہد قدیم سے یہ روایت چلی آرہی ہے اور مشہور ہے کہ اجودھیا میں تھانہ کے پاس نوگزی قبر ہند بن حام بن نوح علیہ السلام کی ہے اور اجھار او پنھیا جھار دو ٹیلوں کے درمیان سات گزی قبر حضرت شیث علیہ السلام کی اور اسی احاطہ میں آٹھ گزی قبر حضرت ایوب علیہ السلام کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی

انجمن کی ان کہی باتیں

میری مراد ہے انجمن ترقی اردو، بہار۔

ہماری ایک مذہبی زبان تھی، عربی۔ جس کے حرفوں اور لفظوں کی ادائیگی سے صحیح تلفظ سامنے آتا تھا۔ ہر بچے کو قرآن حکیم، ناظرہ ختم کر لینے کے بعد ہی اسکول یا مدرسے میں بھیجا جاتا ہے۔ اب اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اور اس کے نتیجے میں ہم اپنی مذہبی زبان کے ذوق سے نابلد ہو گئے۔ دوسری تہذیبی زبان تھی، فارسی۔ جس کے وسیلے سے آداب محفل اور آداب سخن کا شعور نمایاں ہوتا تھا اور بہترین شعری روایتوں سے واقفیت بھی ہو جاتی تھی۔ ہم اب اس سے بھی نا آشنا ہیں اور ہمارے بچوں کیلئے یہ اب ''غیر ملکی زبان'' کی نوعیت اختیار کر گئی۔ ہماری تیسری مادری زبان ہے، اردو۔ اب اس مادری زبان سے بھی ہمارے فاصلے بڑھتے جاتے ہیں۔ گھریلو ماحول میں 'اردو بولنا' تو کسی حد تک بچے سیکھ لیتے ہیں لیکن اردو لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت اور بصیرت ختم ہوتی جاتی ہے۔ جسٹس آفتاب عالم صاحب نے اگر اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کہیں اردو محض کتب خانوں کی زبان بن کر نہ رہ جائے، تو یہ اندیشہ زیادہ غلط بھی نہیں ہے۔ مادری زبان ہی مافی الضمیر کے اظہار کا بہترین وسیلہ بنتی ہے اور خوابوں، تمناؤں اور تخلیقوں کے اظہار کا ذریعہ بھی یہی ہے۔ اب اس مادری زبان، سے ہمارا تعلق یعنی نئی نسل کے نوجوانوں کا تعلق برائے نام ہی ہے۔ شعرو ادب، تخلیق کرنے والے کچھ لوگ تو ابھی ہیں مگر ان کی تخلیقات کو پڑھنے اور سمجھنے والے کہاں ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم تیزی کے ساتھ ایک معاشرتی اور تہذیبی انتشار کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب موضوع تحریر کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ میں ۱۹۶۱ء سے انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں میں شامل رہا۔ پٹنہ میں زیر تعلیم تھا تو تحریک انجمن میں پوری طرح شامل رہا۔ ایک طرف استاذ عالی پروفیسر اختر اورینوی صاحب مرحوم، ترغیب دیتے تھے تو دوسری طرف جناب غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی صاحبان کے جذبۂ اردو دوستی سے تحریک ملتی تھی۔ زبان اردو کا طالب علم تھا اور اس زبان کی حق تلفیوں پر جی کڑھتا تھا۔ اس وقت انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا، قوم دشمنی تھی۔ لیکن میں اپنی پیاری زبان کے لئے ہر ممکن مجاہدہ کرنے کو تیار رہا کرتا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں

ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ایک کنونشن، پٹنہ میں منعقد ہوا۔ اس کی کامیابی کے لئے غلام سرور، پروفیسر عبدالمغنی، سید شاہ مشتاق احمد، مرحوم بیتاب صدیقی، مرحوم تقی رحیم وغیرہ حضرات مسلسل چھوٹے چھوٹے جلسے کرتے رہے اور پٹنہ میں مقیم اردو دوستوں سے مشورے کرتے رہے۔ میں بھی ہر قدم پر معاون بنا رہتا۔ آخر کار کنونشن کا انعقاد ہوا اور اتفاق رائے سے یہ طے ہوگیا کہ اگلے الیکشن میں اردو کو ایک ''مؤثر ایشو'' بنایا جائے۔ ۱۹۶۵ء ہی میں ہندو پاک کی جنگ چھڑ گئی اس کے دوران، انجمن والے خاص طور پر نشانہ بنے۔ جناب غلام سرور، قید و بند میں مبتلا ہوئے۔ میں ''سنگم'' کی ادارت میں تھا۔ میرے لئے بھی ڈی آئی آر کا وارنٹ جاری ہوا۔ غلام سرور صاحب نے جیل سے ہدایت بھیجی کہ اخبار، بند نہ ہو۔ میں نے روپوش رہ کر اخبار کی اشاعت کو جاری رکھا۔ کے۔ بی۔ سہائے کی وزارت تھی۔ کرشن نندن سہائے کے تعاون سے پروفیسر اختر اورینوی نے ایک مچلکہ کی بنیاد پر وارنٹ منسوخ کروایا۔ اخبار جاری رہا۔ پھر ۱۹۶۷ء کے الیکشن میں جناب غلام سرور کی قیادت اور صدارت میں متذکرہ بالا فیصلے پر عمل درآمد کیا گیا۔ ریاست بھر میں ''حقوق اردو'' کے لئے ایک عوامی ماحول تیار کرلیا گیا اور اردو آبادی نے بھی بڑھ چڑھ کر تعاون دیا۔ غلام سرور صاحب کی پر جوش تقریر، پروفیسر عبدالمغنی کی پر جوش تحریر، مرحوم بیتاب صدیقی کی پر خلوص کاوش اور ہم جیسے چند نوجوانوں کی خاموش مگر تیز سرگرمیوں نے الیکشن کا نقشہ بدل دیا۔ کانگریس کو شکست حاصل ہوئی اور اس کی مخالف سیاسی جماعتیں کامیاب ہوئیں۔ مہامایا پرشاد کی قیادت میں مختلف سیاسی جماعتوں نے مل کر وزارت بنالی۔ اس کیلئے ۳۳ رنکاتی پروگرام کو منظوری دی اور اسمبلی و کاؤنسل کا مشترکہ اجلاس ہوا تو گورنر کے خطبے میں بھی اس کا تذکرہ کیا گیا۔ اس ردعمل میں رانچی میں زبردست فرقہ وارانہ فساد برپا ہوا اور شری جے پرکاش نرائن نے اسے لسانی فساد قرار دیا۔ یہ وزارت سال بھر بھی قائم نہ رہ سکی۔ ۱۹۶۹ء میں وسط مدتی انتخاب ہوا اور ۱۹۷۰ء کے جنوری میں میرا تقرر، بہار یونیورسٹی میں ہوگیا اور میں مظفر پور چلا آیا۔

۱۹۷۲ء میں کانگریس پھر برسر اقتدار آگئی۔ جناب عبدالغفور نے وزارت اعلیٰ کا منصب سنبھالا اور اسی دوران جے پی تحریک کا پھیلاؤ تیزی کے ساتھ ہونے لگا۔ اسی سال مظفر پور میں حقوق اردو، کے لئے زبردست عوامی احتجاج ہوا۔ جناب غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کی تحریک پر میں نے یہاں اردو دوستوں کا ایک مؤثر حلقہ تیار کرلیا تھا۔ اردو کے لئے ''سڑکوں پر آنے'' کا معاملہ تھا۔ جلوس اور جلسے کی تاریخ کا اعلان ہوا اور میں پوری مضبوطی اور دلجمعی کے ساتھ اس

پروگرام کو کامیاب بنانے میں مصروف رہا۔ پروفیسر اختر قادری مرحوم، میری سرگرمیوں سے پریشان بھی تھے اور خائف بھی۔ میری سرگرمیاں گویا ''انٹی نیشنل'' تھیں۔ میں نے مرحوم پروفیسر قادری صاحب سے گفتگو کے دوران یہ بھی کہا کہ میں مادری زبان کے حقوق کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہوں، یہ کوئی ''انٹی نیشنل'' رجحان تو نہیں ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ تقسیم ملک کے وقت کی آبادی اردو کا نام لینے سے گھبراتی اور ڈرتی تھی۔ بہر حال میں اپنی کوششوں میں لگا رہا۔ مرحوم عبدالقیوم لعل گنجوی، نور عالم خاں، احمد حسن، جمیل احمد، ایڈوکیٹ، اصغر اعجازی، ایڈوکیٹ سرگرم معاون رہے۔ ٹاؤن ہال سے جلوس نکلا اور شاہراہوں سے ہوتا ہوا، ضلع مجسٹریٹ کے دفتر کے پاس ختم ہوا۔ ''اردو کا حق دو''، ''اردو ہندی بہنیں ہیں، بہنوں میں سنگھرش نہیں'' جیسے نعرے لگائے جاتے رہے۔ جناب غلام سرور، پروفیسر عبدالمغنی، سید شاہ مشتاق احمد، جناب بیتاب صدیقی وغیرہ حضرات پٹنہ سے تشریف لائے تھے اور جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ ضلع مجسٹریٹ کو میمورنڈم دیا گیا۔ اور پھر تلک میدان میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا۔

۱۹۷۵ء میں ریاستی انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس، مظفر پور میں منعقد ہوا۔ میں آرگنائزنگ سکریٹری تھا۔ اسی کانفرنس میں انتخاب کا وہ عمل بھی ہوا جس نے اردو تحریک کو ایک فیصلہ کن موڑ پر لا کھڑا کیا۔ میں مظفر پور کے رفیقان انجمن کے ساتھ اس اجلاس کی کامیابی کے لئے دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ اس کے لئے کئی ذیلی ضلعی جلسے بھی ہوئے جس میں ہم لوگوں کی شرکت ہوئی اس سالانہ اجلاس سے قبل ایک ایسی ہی ضلعی کانفرنس مدھوبنی میں ہوئی تھی۔ مقررہ تاریخ میں شرکت کے لئے ہم لوگ ایک ٹیکسی سے روانہ ہوئے۔ جناب غلام سرور، جناب جمیل احمد ایڈوکیٹ جناب مشتاق احمد انجم اور جناب زین العابدین، اسی گاڑی میں سوار تھے۔ شام کا وقت تھا اندھیرا پھیل چکا تھا کہ شرف الدین پور کے پاس اس گاڑی کی لائٹ اور بریک دونوں ہی چیزوں نے کام کرنا بند کر دیا۔ دونوں طرف گہری کھائیاں تھیں اور ہم لوگ گویا تن بہ تقدیر، دم بخود گاڑی میں جلد از جلد 'کلمہ' کی ادائیگی کی کاوش میں مبتلا تھے۔ اچانک ایک جھٹکہ سا لگا، گاڑی غیر متوازن ہو چکی تھی، ہم لوگوں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی کہ دوسرا جھٹکہ نسبتاً شدید انداز میں محسوس ہوا، کوئی چیز دھب سے گری اور گاڑی، سرسراتی آگے بڑھتی گئی حتیٰ کہ رک گئی۔ گاڑی رکنے کے بعد میں نے جائزہ لیا کہ سب لوگ تھے، ایک غلام سرور صاحب نہیں تھے۔ بقیہ لوگ ہانپتے گاڑی سے باہر آئے۔ زین العابدین صاحب کے آگے کے ایک یا دو دانت ٹوٹ گئے تھے، جمیل صاحب اور

مشتاق صاحب کو بھی ہلکی چوٹیں تھیں۔ میرے گھٹنے میں چوٹ آئی مگر ہم سب اپنی تکلیف بھول کر غلام سرور صاحب کی جستجو میں لگ گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ گنے کا کھیت تھا جس میں گاڑی لڑھک گئی تھی اور گنوں کی کٹی ہوئی جڑیں ابھی موجود تھیں، جن کی وجہ سے گاڑی آگے بڑھنے یا الٹنے سے بچ گئی۔ بہرنوع، غلام سرور صاحب بھی رات کی اس تاریکی میں گنے کے کھیت میں مل گئے۔ وہ آگے کی سیٹ پر بائیں طرف بیٹھے تھے، خطرے کو محسوس کرتے ہی وہ گاڑی کھول کر Jump کر گئے۔ پسلیوں میں چوٹیں بھی آئی تھیں۔ پھر ہم لوگ واپس مظفر پور آگئے اور شہیدان اردو، ہوتے ہوتے بچ گئے۔ اس وقت مظفر پور اور پٹنہ کے درمیان اسٹیمر کا راستہ تھا۔ میں پوسٹرس اور ہینڈ بلس کے پلندے کاندھے پر لاد کر اسٹیمر سے ٹرین پر لاتا اور صبح سویرے مظفر پور پہنچ کر ان پوسٹروں اور ہینڈ بلوں کو شمالی بہار کے تمام اضلاع میں بھیجتا رہتا اور محبان اردو کے پر خلوص تعاون سے پیغام اردو، تمام گلی کوچوں، مدرسوں اور اسکولوں میں پہنچتا رہا۔

یہ سالانہ اجلاس و انتخاب نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوا۔ بہار بھر سے نمائندگان انجمن سمٹ کر آگئے۔ ٹاؤن ہال کے وسیع و عریض میدان میں شامیانوں اور خیموں کی تنصیب ہوئی۔ کچھ محبان اردو نے اپنے گھروں پر مہمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام کیا اور پھر مظفر پور کلب اور ہوٹلوں کے کمرے مخصوص کرائے گئے۔ دہلی سے ڈاکٹر خلیق احمد انجم بھی تشریف لے آئے۔ تجاویز کے اجلاس کے بعد، انتخابی اجلاس ہونا تھا اور پھر شب میں مشاعرے کے انعقاد کا پروگرام تھا۔ تجاویز کے اجلاس ہی میں جناب غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کا نظریاتی اختلاف نمایاں ہو گیا۔ دونوں حضرات، عہدۂ صدر کے لئے امیدوار تھے۔ میرا رابطہ ان دونوں ہی حضرات سے تھا اور میں اس کوشش میں تھا کہ مفاہمت کی کوئی راہ نکل جائے، ہنگامہ آرائی نہ ہو، خون خرابہ نہ ہو۔ اس سے اردو مخالف کیمپ میں چراغاں ہوگا۔ پروفیسر اختر قادری صاحب انتخابی اجلاس کے صدر تھے۔ (یہ وہی پروفیسر اختر قادری صاحب تھے جنہوں نے انجمن کی سرگرمیوں سے الگ رہنے کی مجھے تلقین کی تھی) میں نے ہی ان کا نام تجویز کیا تھا اور پروفیسر عبدالمغنی اور غلام سرور صاحبان نے اس کی تائید کی تھی۔ انتخابی اجلاس کے وقت ایوان کی گرمی کو دیکھ کر پروفیسر اختر قادری صاحب کچھ پریشان سے ہو گئے۔ کیوں کہ دونوں ہی حضرات (یعنی غلام سرور اور عبدالمغنی صاحبان) صدارت کے خواہاں تھے اور دونوں ہی کے حامیوں میں جوش و خروش تھا۔ میں نے عین اجلاس کے وقت پروفیسر اختر قادری صاحب سے مشورہ کیا کہ اگر یہ حضرات کسی کو ثالث

مان لیں تو گاڑی نکل جائیگی۔ پروفیسر اختر قادری صاحب نے اس کی حمایت کی اور تب میں جناب غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی صاحب سے ملا۔ یہ تجویز ان کے سامنے رکھی۔ ان حضرات نے سوال کیا کہ ثالث کون ہوگا؟ میرے ذہن میں پہلے سے کوئی نام نہ تھا۔ مگر فوراً ہی یہ بات ذہن میں آئی کہ ڈاکٹر ظفر حمیدی صاحب اگر چہ انجمن کی سرگرمیوں سے عملی طور پر کوئی تعلق نہیں رکھتے، غیر جانبدار اور اردو دوست ہیں۔ اب تک ان کو کچھ کہا نہیں گیا ہے اور نہ انہیں کچھ معلوم ہے۔ کیوں نا انہیں کا نام ثالثی کے لئے اختیار کرلیا جائے۔ صدارت کے دونوں ہی امیدواروں نے اس تجویز کو مان لیا اور صدر جلسۂ انتخاب نے بھی حمایت کردی۔ تب میں دوڑا ہوا ڈاکٹر ظفر حمیدی صاحب کے پاس پہنچا۔ ثالثی کے لئے آمادہ نہ ہو رہے تھے۔ میرے اصرار پر انہوں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ میں نے یہ عرض کیا کہ ہماری خواہش بس یہ ہے کہ ہنگامہ آرائی نہ ہو اور ان دونوں ہی حضرات کی قیادت انجمن کو حاصل رہے کیونکہ دونوں ہی مادری زبان کا درد رکھتے ہیں اور انہوں نے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی چراغ اردو کو روشن رکھا ہے۔ پھر میں نے گزارش کی کہ غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی صاحب سے پہلے مشورے کرلیں اور یہ مشورے بالکل انفرادی سطح پر ہوں۔ ہماری تمنا ہے کہ ایک صدر کی حیثیت اختیار کرلیں اور دوسرے کو سکریٹری کا عہدہ ملے تا کہ انجمن کی مؤثر قیادت ہوتی رہے۔ تب صدر جلسہ یعنی پروفیسر اختر قادری صاحب سے اجازت لے کر ڈائس پر تشریف لے جائیں اور ثالثی کی ذمہ داری کا اعلان فرمائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دونوں ہی سربراہان اردو یعنی پروفیسر عبدالمغنی اور غلام سرور صاحب نے ڈاکٹر ظفر حمیدی صاحب مشوروں کے بعد مائک سے اعلان کیا کہ ثالث کا جو فیصلہ ہوگا، اسے یہ حضرات قبول کرلیں گے۔ پھر ڈاکٹر ظفر حمیدی صاحب مائک پر تشریف لائے، انہوں نے قرآن حکیم کی چند آیات تلاوت کیں اور مختصری تمہیدی تقریر کی۔ اس سے پہلے انہوں نے استخارہ دیکھا، فال نکالی مگر اسے پوشیدہ رکھا تھا اور تب انہوں نے صدر کی حیثیت سے پروفیسر عبدالمغنی کے نام کے انتخاب کا اعلان کردیا۔ ابھی سکریٹری کے نام کے انتخاب کا اعلان باقی ہی تھا کہ ہنگامے شروع ہوگئے۔ کرسیاں اٹھا اٹھا کر پھینکی جانے لگیں۔ اور دونوں طرف کے حامیوں میں تصادم کا ماحول پیدا ہوگیا، اور بھگدڑ مچ گئی۔ جلسہ گاہ سے مندوبین بھاگنے لگے۔ پانچ بجے شام تک جلسہ گاہ خالی ہوگیا۔ اب شام کے عوامی اجلاس کا انتظام کرنا تھا اور آرگنائزنگ سکریٹری کی حیثیت سے میری ذمہ داری یہ بھی تھی کہ شب کے مشاعرے کے انعقاد کا پروگرام بھی کامیابی کے ساتھ انجام پذیر کرایا جائے۔ میں ایک

گھنٹہ کے لئے اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا، مظفر پور کے چند رفیقان انجمن بھی ساتھ تھے۔ تلک میدان روڈ کے قریب مجھ پر چھرے سے حملہ ہوا مگر محفوظ رہا۔ جلد ہی مظفر پور کے رفیقان انجمن کے ساتھ واپس ہوا۔ مظفر پور کے قصبات سے شہر کے گوشے گوشے، اردو عوامی دستے آنے لگے تھے۔ بعد نماز مغرب کھلے اجلاس کا انعقاد ہونا تھا۔ ساڑھے چھ بجے تک ہزاروں ہزار افراد کا عظیم اجتماع ٹاؤن ہال کے میدان میں ہوگیا۔ آل انڈیا انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی صدارت میں یہ عظیم الشان کھلا اجلاس منعقد ہوا۔ میں نے منظور شدہ تجاویز پڑھ کر سنائیں، جن کی تائید میں ہزاروں ہاتھ ہوا میں لہرا لہرا کر اپنے آہنی عزم کا اظہار کرتے رہے۔ اس اجلاس کا اختتام ۹ بجے شب میں ہوا اور اس کے بعد مشاعرہ کا دور شروع ہوگیا، یہ رات بھر جاری رہا۔

مشاعرے کے آغاز کے بعد ہی میں اپنی قیام گاہ پر واپس آگیا۔ رات بھر تمام دستاویزات کو مرتب کرتا رہا اور انجمن کے اس سالانہ اجلاس کی ایک تفصیلی رپورٹ بھی میں نے تیار کرلی۔ چونکہ ڈاکٹر خلیق انجم کو دوسری صبح واپس ہونا تھا، اس لئے یہ رپورٹ ان کے حوالہ کی جسے انہوں نے انجمن کے ترجمان اخبار ''ہماری زبان'' میں شائع کردیا۔

پروفیسر عبدالمغنی نے صدر کی حیثیت سے اپنی مجلس عاملہ مکمل کرلی۔ جس کے جنرل سکریٹری جناب کلام حیدری اور خازن ہارون رشید صاحب بنائے گئے۔ جمیل احمد، ایڈوکیٹ مظفر پور، پروفیسر ابوذر عثمانی، رانچی اور پروفیسر مظفر اقبال، بھاگلپور، اس کے نائبین صدر مقرر ہوئے۔ مجھے ایک عہدہ دیا گیا میں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ میرے لئے ریاستی عاملہ کی رکنیت ہی کافی تھی۔ اس دوران انجمن کے انتخاب پر مقدمہ ہوگیا۔ اس مقدمے کا فیصلہ آخر کار پروفیسر عبدالمغنی صاحب کے حق میں ہوا اور اب انجمن ترقی اردو، بہار نے اردو کے حقوق کے حصول کے لئے ایک نئے عزم و اعتماد کے ساتھ تحریک کو آگے بڑھانے کی کاوش کی۔ ۱۹۸۰ء میں پھر عام انتخاب کا مرحلہ آیا۔ صدر انجمن کے اصرار پر کانگریس (آئی) نے اپنے منشور میں اس کا وعدہ کیا کہ پارٹی برسر اقتدار آگئی تو زبان اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیدے گی۔ دوسری کسی سیاسی جماعت نے اپنے انتخابی منشور میں یہ وعدہ نہیں کیا تھا اس لئے انجمن والوں کے لئے امید کی ایک ہی کرن تھی یہ کہ کانگریس (آئی) اقتدار میں آجائے تاکہ انتخابی منشور کی روشنی میں اس پر وعدہ وفا کرنے کے لئے زور ڈالا جائے اور عوام نے اس انتخابی منشور پر بھروسہ کرتے ہوئے کانگریس (آئی) کو تعاون دیا اور یہ پارٹی کامیاب ہوگئی۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا، وزیر اعلیٰ بنائے

گئے۔ وزارت بنتے ہی، انجمن نے اردو زبان کے مطالبات و مسائل، ان کے سامنے رکھے۔ مگر اب وہ قیل قال کرنے لگے اور آنکھیں چرانے لگے۔ سچ یہ ہے کہ خود ان کی پارٹی میں بہت سے ایم ایل اے ایسے تھے جو اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینا نہیں چاہتے تھے اور ڈاکٹر مشرا کو اپنی وزارت بھی بچانی تھی۔ اس کے ردعمل میں پروفیسر عبدالمغنی کی سربراہی میں قائدین انجمن نے بہار بھر کا طوفانی دورہ کیا۔ آغاز مظفر پور سے ہوا ایک بار پھر ہم لوگ پوری طرح متحرک ہو گئے۔ مظفر پور کے مسلم کلب میں ایک عوامی جلسہ ہوا جس میں قائدین انجمن نے پہلی مرتبہ، حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ڈاکٹر مشرا کو نومبر ۱۹۸۰ء تک کی تاریخ دیدی گئی کہ اگر اس دوران زبان اردو کو اس کا حق نہیں دیا گیا، کانگریس (آئی) نے اپنے انتخابی منشور کے وعدے پر عمل نہیں کیا تو بہار بھر کے اردو عوام، کانگریس کی وزارت کے خلاف سڑکوں پر نکل آئیں گے اور ریاست بھر میں احتجاجات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۸۰ء میں اندرا گاندھی، وزیر اعظم ہند کی سالگرہ کے موقع پر زبان اردو کو ریاست بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیدیا گیا اور آرڈننس جاری کر دیا گیا۔ اس وقت کانگریس کے صدر رفیق عالم صاحب تھے اور نصیر الدین حیدر خاں، ایک اہم کابینہ وزیر تھے۔ ان حضرات نے بھی اپنے اپنے طور پر سرگرم تعاون دیا۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں بہار اسمبلی کا اجلاس ہونا تھا۔ انجمن ترقی اردو بہار نے وزیر اعلیٰ سے مطالبہ کیا کہ اسمبلی کے اسی اجلاس میں قانون اردو کی منظوری لے لی جائے۔ چنانچہ دستور کی دفعہ ۳۴۵ کے تحت ۱۹۵۱ء کے آفیشیل لینگویجز ایکٹ میں ایک ترمیمی بل کے ذریعہ ''بہار آفیشیل لینگویجز (امنڈمینٹ) ایکٹ ۱۹۸۰ء'' بہار اسمبلی سے منظور ہوا اور اس کی رو سے بہار (غیر منقسم) کے پندرہ اضلاع میں زبان اردو کے سرکاری استعمال کے لئے گزٹ نوٹی فکیشن جاری کر دیا گیا۔ بعد میں ستیندر نرائن وزارت نے بہار کے تمام اضلاع میں اردو عوام کی سہولت کے لئے زبان اردو کے استعمال کا نوٹی فکیشن جاری کیا۔ ڈاکٹر مشرا نے بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ انتخابی منشور کے وعدے کی تکمیل کر کے اردو عوام کے لسانی جذبات کی تکمیل اور تسکین کی تھی اور اس میں یقیناً وزیر اعظم اندرا گاندھی کی مرضی اور منظوری بھی شامل تھی۔ اس قانون اردو کے نتیجے میں سینکڑوں مترجمین اور اردو ٹائپسٹوں کی بحالی عمل میں آئی۔ زبان اردو کے سرکاری زبان کے لئے جن خاص کاموں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ وہ درج ذیل ہیں۔

ا۔ اردو زبان میں جو درخواستیں، دفتروں میں دی جائیں، ان کو وصول کیا جائے اور ان کا جواب اردو میں مہیا کرایا جائے۔

۲۔ زبان اردو میں جو دستاویزیں لکھی جائیں، ان کو رجسٹریشن آفس قبول کرے۔
۳۔ عوامی اہمیت کے اہم سرکاری قواعد، حکم نامے اور اعلانئے اردو میں بھی شائع کئے جائیں۔
۴۔ عوامی ضرورت کے سرکاری احکام وہدایات، زبان اردو میں بھی جاری کئے جائیں۔
۵۔ اہم سرکاری اشتہارات اردو میں بھی شائع کئے جائیں۔
۶۔ ضلع گزٹ کا ترجمہ اردو میں بھی شائع کیا جائے۔
۷۔ اہم سائن بورڈوں اور رسمی تختیوں کو اردو میں بھی لکھا اور لگا جائے۔

مجھے افسوس ہے کہ اردو آبادی اب ان سات کاموں کے لئے بھی اردو زبان کا استعمال نہیں کر پا رہی ہے اور جو مترجمین اور اردو ٹائپسٹ بحال ہیں وہ بالعموم اردو میں کام نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات تو اردو درخواست گذاروں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ تھانوں میں اردو میں رپورٹ درج کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ حدتو یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو بھی ان کی مادری زبان اردو کے شعور سے الگ تھلگ کرتے جارہے ہیں۔ پھر آئندہ دس بیس برسوں کے بعد اردو شعر وادب، پڑھنے اور سمجھنے والے بھی کہیں کہیں ملا کریں گے، اردو دھیرے دھیرے اردو کلچر سے ہمارا رشتہ منقطع ہوتا جائے گا۔ جن سنگ میل کی تنصیب ہو چکی ہے وہ اکھاڑ دیئے جائیں گے۔ اور یہ سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ گذشتہ دس برسوں کے دوران نہ ایک اردو مترجم کی بحالی ہوئی ہے اور نہ اردو ٹائپسٹ کی سرکاری سطح پر زبان اردو کے جائز اور قانونی حقوق کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذمہ دار خود ہم لوگ ہیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ کرپوری وزارت کے عہد میں پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب، بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انجمن ترقی اردو کی احتجاجی کانفرنس میں مجھے پٹنہ جانا تھا۔ وائس چانسلر نے مجھ سے پوچھا کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے سے فائدہ کیا ہوگا؟ میں نے جواب دیا تھا کہ فائدے تو خود بخود سامنے آتے جائیں گے۔ بشرطیکہ اردو والے مستعد ہوں اور سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اپنی مادری زبان کا ہم نام لیں گے اور استعمال کریں گے تو کوئی ''غیر ملکی ایجنٹ'' نہیں کہہ سکے گا۔ کیوں کہ زبان اردو بھی ہماری سرکاری زبان بن چکی ہوگی۔ یہ ''ہتک آمیز اور شرمناک الزام'' ہم کب تک گوارا کرتے رہیں گے۔ اللہ کا شکر واحسان ہے کہ اب وہ منزل ہمارے سامنے ہے، اردو ہماری مادری، ریاستی اور قومی زبان ہے۔ ہم نے اگر اس کے چلن اور استعمال کو قائم رکھا تو آج بھی اس کی غیر معمولی قوت اور حلاوت، عوامی ماحول پر راج کرے گی۔ مگر اب یہ ذمہ داری ہماری نسل تازہ پر عائد ہوتی ہے کہ زبان اردو کے حقوق کے تحفظ کے لئے اپنی جدوجہد کو جاری رکھے۔

ڈاکٹر انیس صدری

سمستی پور۔ ماضی کے آئینے میں۔۱

شمالی بہار میں ان۔ای۔ریلوے کا سب سے قدیم اور خوبصورت اسٹیشن سمستی پور اپنے محل وقوع اور تاریخ و تہذیب کی باضابطہ شناخت ۱۸۷۴ء سے رکھتا ہے۔یہی شہر عہد تغلق میں حاجی الیاس۔ شمس الدین کے نام سے موسوم ہو کر ایک زمانے تک شمس الدین کے نام سے ہی تواریخ میں معروف ہوا جو بعد کو کثرتِ استعمال سے سمستی پور ہو گیا۔تاریخ داں جانتے ہیں کہ عہد اسلامیہ میں دربھنگہ (ترہت) اپنے بہتر انتظامی امور علم و ادب اور تہذیب ثقافت میں اپنی عظمت و شہرت کی داد دلی و کلکتہ دونوں سے پاتا رہا۔جس کی شہادتیں آج بھی جا بجا تاریخی مقامات، قلعوں، فصیلوں، خانقاہوں، تالابوں اور شکستہ مزاروں کی ڈھتی ہوئی دیواروں کی تعمیری قدروں سے مل سکتی ہیں۔

یہ شہر سمتی پور دربھنگہ ضلع کا ہی ایک حصہ اور سب ڈویژن تھا جو ۱۹۷۱ء میں دربھنگہ سے الگ ہو کر باضابطہ ضلع بن گیا۔زمانہ قدیم سے یہ شہر بوڑھی گنڈک ندی کے جنوبی کنارے پر بسا گنگا ندی کی اتری جانب میدانی علاقوں میں اتر سے دکھن تقریباً ۷۰ کیلومیٹر اور پچھم سے پورب تقریباً چالیس کیلو میٹر پر محیط ہے جو برسات میں آسمانی بارش سے اور چیت بیساکھ میں گنگا و گنڈک سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے۔اس شہر (شمس الدین پور) کا گنگا ندی سے اتصال اس ضلع کی زریں تاریخ کا خوبصورت باب ہے جسے مورخوں اور ادیبوں نے کبھی وا کرنے کی سعی نہیں کیا۔

ہندوستان کی قدیم و تاریخ و ثقافت کی سرگرمیوں میں ندیوں سے زیادہ کسی دوسرے رسل و رسائل کی اہمیت نہیں۔یہی وجہ ہے کہ تہذیب و ثقافت اور صنعت و حرفت کے علاوہ علم و ادب کے تمام اہم مراکز کسی نہ کسی ندی کے کنارے ہی ترقی پذیر ہوئے چاہے وہ شہر دلی و کلکتہ ہوں یا بنارس والہ آباد اور پٹنہ یہ تمام بڑے شہر بڑی ندیوں کے کنارے آمد و رفت کے رسائل کی سہولت کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں نہ صرف اہمیت کے حامل بن گئے بلکہ ان شہروں میں بیشتر کو دارالسلطنت کا مرتبہ بھی ملا ہے۔اس حیثیت سے سمستی پور دوآبہ یعنی گنگا و گنڈک کے درمیان کب سے بسا ہوا ہے تاریخ خاموش ہے۔لیکن اس شہر اور علاقے کی قدامت کی تاریخی شہادتیں سطح زمین اور زیر زمین آج بھی دعوت مطالعہ دے رہی ہیں۔

پورانی کتھاؤں[۲] اور متھلا کی روایتوں کے مطابق راجہ جنک کی جائے پیدائش جنکپور، اور

ستیاجی کی جائے پیدائش سیتامڑھی کے علاقے سمستی پور کے حدود اربعہ کی دو آخری حدیں ہیں یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ قدیم ترہت کمشنری میں ہی سمستی پور، سیتامڑھی اور جنک پور یا مدھوبنی وغیرہ کی شمولیت تھی۔ چنانچہ ہم پاتے ہیں کہ ترہت کمشنری (قدیم) کے پوربی اور اتری حصے کی بڑی آبادی کی زبان ایک زمانے سے میتھلی رہی ہے جو تہذیب وثقافت کے اعتبار سے تاریخ ہند میں گراں قدر سمجھی جاتی رہی ہے خاص طور پر متھلا ثقافت کے حوالے سے اس زبان کے لوگ گیت، اس علاقے کا پکوان، پان، اور مانچھ ومکھانا دنیا میں مقبول ہیں۔ اس متھلا دیس کا بعض حصہ ضلع سمستی پور میں واقع ہے۔ جہاں مشہور میتھلی شاعر ودیاپتی اپنی زندگی کا آخری حصہ گذارتا ہے۔

مورخ[۳] اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت تاج فقیہ ۱۱۸۰ء مطابق ۵۷۶ھ میں بہار منیر شریف تشریف لائے اور یہیں سے تبلیغ وہدایت کا باضابطہ کام شروع ہوا، پھر ان کی ہدایت کے مطابق ان کی اولاد میں حضرت اسمٰعیل شمالی بہار تشریف لائے اور حاجی پور کے علاقے میں قیام پذیر ہو کر ان کی اولادوں نے شمالی بہار کے اکثر علاقوں میں تبلیغ وہدایے کے کام کیے۔ تقریباً یہی زمانہ ۱۲۰۲ء بختیار خلجی کا ہے جس نے سارن (موجودہ چھپرہ) کے علاقے کو فتح کر کے دربھنگہ پر فوج کشی کی اور یہاں کے راجہ ہرسنگھ دیو کو زیر کیا اس کے بعد شمالی بہار پر دوسرا حملہ ۱۲۲۵ء مطابق ۶۲۲ھ میں التمش نے کیا اور فتح یاب ہوا۔ تیسرا حملہ علاء الدین خلجی کے عہد میں ۱۲۹۵ء تا ۱۳۱۶ء ہوتا رہا اور سکر سنگھ دیو کو دولت خلجیہ کا باج گذار بننا پڑا اس کے بعد چوتھا حملہ سلطان غیاث الدین نے کیا اور یہاں کے راجہ ہرسنگھ دیو کو ۱۲۲۶ء میں شکست دیا۔ راجہ ہرسنگھ دیو نے ہرسنگھ پور قلعہ میں پناہ لی لیکن اسے وہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ سلطان اس قلعے کی قلعہ داری حضرت شاہ صوفی قدس سرّہ کو تفویض کی جہاں سے رشد و ہدایت کی کرنیں پھوٹیں۔ اس تاریخی پس منظر میں ہماری نگاہ سمستی پور کے قصبہ محی الدین نگر کی شاہی مسجد کی طرف جاتی ہیں جس کی تعمیر ۹۱۸ھ میں ہوئی تھی یہ مسجد غلام خاندان کے طرز تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہے جس کے درمیانی باب پر کالے پتھر کا کتبہ ہے جس پر تحریر ہے ''ابوبکر، عمر، عثمان، حیدر اور اسی عبارت کے نیچے ۹۱۸ھ ہے۔'' مسجد کے تین دروازے اور تین خوبصورت گنبد ہیں چونا سرخی کا پلاسٹر ہے۔ اینٹ اس کی لکھوری قدیم وضع کی ہے جو سمستی پور کے اکثر قدیم خانقاہوں اور گڑھیوں میں آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں اسی وضع کی ایک عمارت مسجد حاجی پور میں بھی ہے۔ بہر حال یہ قصبہ محی الدین نگر گنگا ندی کے اتری کنارے سمستی پور صدر مقام سے تقریباً ۳۵ کیلومیٹر دکھن میں واقع ہے جو کبھی تجارت کی بڑی منڈی اور آبی راستے کی آمدرفت کا بارونق علاقہ تھا جہاں شاہ منور الدین صوفی بزرگ

نے علم وادب کی شمعیں روشن کیں۔ کہا جاتا ہے کہ کریم نگر جو اس سے متصل ہی ہے وہاں بھی کئی عالم با عمل کی خانقاہیں تھیں جسے لوگوں نے برباد کر دیا۔ محی الدین نگر میں نادر ونایاب کتابوں کا ذخیرہ تھا جسے دیکھنے والوں نے بتایا کہ کتابوں کی بوسیدگی اور اس کی قدامت حفاظت کے دائرے کے حد سے نکل گئی تو لوگوں نے تمام ذخائر کتب کو دفن کر دیا۔ راقم کے پاس ایک اردو مخطوطہ معالج نامہ ہے جو حکیم حاجی پوری کی تخلیق ہے اور مجھے یہ مخطوطہ محی الدین نگر کے ہی خانوادے سے دستیاب ہوا۔

اسی گنگاندی کے اتری کنارے محی الدین نگر سے کچھ پورب ایک تاریخی موضع شیورہ بھی ہے یہاں خانقاہیں، مزارات اور مسجد تاریخ وثقافت کی گواہ ہیں۔ شاداں فاروقی صاحب نے بزم شمال میں لکھا ہے کہ حضرت پیر شاہ ذکریا قدس سرہ حضرت قاضن شطاری کے برادرِ دہم تھے۔ یہاں دسویں صدی ہجری میں اخوت ومحبت اور رشد وہدایت کا باب تھا۔ یہاں کے بزرگوں نے علاقائی تہذیب و ثقافت اور بول چال کی زبان کو جلابخشی حضرت ذکریا کی زبان سے نکلا یہ دوہرہ سمستی پور کے اردو زبان کے ارتقا کا نادر نمونہ ہے آپ بھی شعر نما دوہرے سے محظوظ ہوں ۔

شیورہ بھی اک شہر ہے بساندی کے تیر عادل شاہ نے پل بنوایا شاہ ذکریا پیر

اس قصبہ شیورہ سے کچھ اور پورب ودیاپتی نگر میں ودیاپتی شاعر کی آخری آرام گاہ سمستی پور کی ثقافتی تاریخ کا وہ ادبی یادگار ہے جن کی شاعری میں عربی وفارسی کے الفاظ اور مسلم تہذیب و ثقافت کا خوبصورت بیان ہے۔ ودیاپتی ابراہیم شاہ شرق والی جون پور ۱۴۰۲ء مطابق ۸۰۵ھ کا بھی مداح جس نے اسی سال ترہت کو فتح کیا تھا۔ ودیاپتی نگر سے پورب اور اتر سمستی پور کے مشرق سرحد پر جمواری ندی کے کنارے ایک شاہی مسجد نور جہاں کی بنوائی ہوئی ہے۔ جناب پروفیسر سید حسن عسکری مرحوم کے بقول نور جہاں نے دلی سے بنگال کے دوران سفر گنگا کے کنارے کئی جگہ قیام کیا تھا انہیں میں یہ گاؤں ہے۔ جہاں کی مسجد سمستی پور کی تاریخ اور بھی واضح کرتی ہے۔ عسکری صاحب کہتے تھے کہ اس مسجد میں ایک مسبوط کتبہ سنگ مرمر کا تھا جسے کسی نے غائب کر دیا ہے۔ یہ کتبہ تاریخ مغلیہ میں سمستی پور کی حیثیت کی سند تھی۔ عسکری صاحب یہ بھی کہتے تھے تاجپور جو ۱۸۹۲ء تک ترہت کمشنری کا سب ڈویژن تھا تاج خاں کے فوجی مہم کا اسٹیشن تھا اور بازار تاج پور اسی کے نام پر بسا ہوا ہے جو عہد اکبری کی داستان ہے اور اس واقعے کا ذکر اکبر نامہ میں موجود ہے۔ (جاری)

ا۔ عہد اسلامیہ میں دربھنگہ مضمون از الیاس رحمانی۔ مطبوعہ معاصر، پٹنہ۔ ۱۹۴۹ء۔ ۲۔ آئینہ ترہت از منشی بہاری لال فطرت۔ ۱۸۶۳ء۔ ۳۔ بزم شمال جلد اول از شاداں فاروقی۔ ۱۹۸۴ء۔

اقبال انصاری

فراز

کمرے میں جو خاتون...... بلکہ میڈم داخل ہوئیں انہیں دیکھ کر کہا تو صرف ''مرحبا'' جا سکتا تھا' سوچا بہت کچھ جا سکتا تھا۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکیں گے کہ مرحبا کہنا ہم بھول گئے تھے، یا ہمیں یہ یاد ہی نہیں آیا کہ ایسے موقعوں پر مرحبا کہنا چاہئے۔ بہر حال کوئی نہ کوئی حادثہ ہوا ضرور تھا۔ ہم کرتے بھی کیا۔ آنکھوں کے سامنے منظر ہی ایسا تھا۔

ہر پہلو شگفتہ' ہر زاویہ شاداب۔ ادھر سے اُدھر تک رعنائی' اوپر سے نیچے تک زیبائی۔ جہاں نظر ڈالئے، مرصع، جدھر سے دیکھئے، مفرح۔ محیّر الحواس، محرک الجذبات۔ کافر آناً فاناً مزید کافر ہو جائے، پارسا کھڑے گھاٹ پارسائی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کسی مرشد کی محفل میں پہنچ جائیں تو مرشد پہلا کام یہ کرے کہ سارے مریدوں کو وہاں سے بھگا دے۔ جوشؔ صاحب دیکھ لیتے تو اس پیر کی جگہ اپنا تخلص فٹ کر دیتے جس کے ہاتھ سے ''فتنۂ خانقاہ'' میں تسبیح گر گئی تھی۔ صاف گو آدمی تھے، جھوٹ ہرگز نہ بولتے، اور مصرعے کے وزن میں بھی فرق نہ آتا۔ بہر حال بس یہ سمجھ لیجئے کہ ہماری نئی میڈم ایک ایسا مصرعہ تھیں جس پر گرہ لگانے کو متندی تو مبتدی، کہنہ مشق تک اچکنے لگتے۔ ایک ایسی غزل تھیں جسے اپنی بیاض میں شامل کرنے کے لئے ستر سالہ شاعر تک فوجداری پر اتر آتے۔ منجملہ ایسی کہ چنگیز خاں تک اگر ایک بار دیکھ لیتا تو اپنی جملہ چنگیزیت پر لات مار کر قدموں میں گر جاتا۔ مطلق العنان ملتجی ہو جاتا، ملک، ملتمس، سائنس داں دیکھ لیتا تو سائنس پر لعنت بھیج کر ''فاعلن فاعلن'' کرنے لگتا۔ مردہ دیکھ لیتا تو یہ سوچے بغیر کہ شرکائے جنازہ کیا سوچیں گے آہیں بھرنے لگتا۔ بھرے بھرے جسم پر...... بلکہ ہرے بھرے جسم پر سیاہ پتلون، پوری یعنی کلائی تک کی آستینوں، اونچے چوڑے کالر اور رانوں تک کی لمبائی والی دودھ جیسی سفید کچھ ڈھیلی اور کچھ چست قمیض، سر پہ آسمانی رنگ کا اسکارف جس کے دو کونوں کو کانوں کے اوپر سے لا کر ٹھوڑی کے نیچے گلے پر گانٹھ لگا دی گئی تھی۔ پیشانی کے اختتام پر تھوڑے سے باریک سنہرے شریر بال اپنی جھلک دکھا رہے تھے۔ رنگت روایتی خوبصورتی کی حامل، آنکھیں بھوری سی جن پر لمبی لمبی پلکیں اتنے دھیمے سے جھکتی تھیں کہ ہمارا جی چاہتا کہ یہ عمل جاری رہے اور ہم نظارہ کرتے رہیں۔ چہرے پر بہت سارا میک اپ جو سارا کا سارا اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔

ساری کلاس تعظیماً کھڑی ہو گئی۔ چونک کر ہم بھی کھڑے ہو گئے۔

میڈم نے مسکرا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولیں ''سلام علیکم''

''وعلیکم السلام'' ساری کلاس نے یک زبان ہو کر کہا۔

اس سے پہلے کہ کوئی اور کچھ کہتا یا میڈم کچھ کہتیں ظہور کی آواز ابھری ''خوش آمدید خاتونِ زیبا'' میڈم کی نگاہ ظہور کے کشادہ پیشانی، تقریباً نصف گالوں تک کھلنے والے دہانے، کچھ چھوٹی آنکھوں موٹے ہونٹ اور گھنی ابرو والے چوڑے سانولے کلین شیو چہرے پر ٹھہر گئی۔ کئی لمحے تک ان کی نگاہ ظہور کے چہرے پر مرکوز رہی پھر مسکراتے ہوئے انہوں نے بڑے نارمل لہجے میں کہا ''خیلی متشکرم'' (میں بہت مشکور ہوں)۔ من نکہت فراز (میں نکہت فراز ہوں)

''خوب'' ظہور بولا ''نام بھی بہت خوبصورت ہے۔ حالتون چطورہ (آپ کا مزاج کیسا ہے؟)''

''خوبم۔ خیلی ممنونم'' میڈم نے مسکرا کر ظہور سے کہا' پھر پوری کلاس سے مخاطب ہوئیں'' شما چطورین؟ (آپ سب کیسے ہیں؟)

''خوبن۔''

میڈم نکہت فراز کا تقرر ہمارے کالج میں مولوی اطہر علی کے ریٹائر ہونے کے بعد فارسی کی لکچرر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ کئی سال ایران میں رہ چکی تھیں۔ وہیں دانشگاہ تہران (تہران یونیورسٹی) سے فارسی میں ایم اے کیا تھا اور ڈاکٹریٹ لی تھی۔ ہم سب ان کے تقرر سے بے حد خوش ہوئے۔ ہر شعبے میں ایک دو لیڈی لکچرر تھیں۔ نہیں تھیں تو بس فارسی کے شعبے میں۔ یہاں تو لے دے کے بس مولوی اطہر علی تھے جو نہ جانے کن کن منزلوں سے گزر کر فارسی میں ایم اے اور نہ جانے کن کن سفارشوں کے زور پر ہمارے کالج میں لکچرر ہو گئے تھے۔ وہ کیسا پڑھاتے تھے، ان کا مزاج کیسا تھا، ان کی آواز کیسی تھی، ان کا لہجہ کیسا تھا، ان کا اخلاق کیسا تھا، ان کی شکل صورت کیسی تھی۔ یہ سب باتیں ذیلی تھیں، غیر اہم تھیں۔ ان کے سلسلے میں بنیادی اور اہم بات یہ تھی کہ ہر صاحب ناک ان سے کافی فاصلے پر ہی رہنا پسند کرتا تھا، اس لئے کہ ان کے جسم سے خارج ہونے والی بدبو اتنی طاقتور تھی کہ شیروانی توڑ کر خارج ہوتی رہتی تھی۔ پتہ نہیں جمعہ کے جمعہ نہاتے تھے یا جاڑے کے جاڑے۔

اس لئے جب میڈم فراز کو دیکھا تو ہمیں کچھ ایسی فرحت محسوس ہوئی گویا بہار قبل از وقت آگئی ہو۔ اسم بامسمّٰی یعنی سراپا خوشبو تو خیر تھیں ہی، مجسم شباب بھی تھیں اور مکمل تبسم بھی۔ ایک ذرا گہری نگاہ سے دیکھا تو لگا جیسے خوشبو کو ایک مستبسم جسم مل گیا ہو۔ عمر کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ بے حد جوان تھیں۔ آپ کہیں گے یہ کیا بات ہوئی؟ تو ہم کہیں گے کہ ان کی جیسی جوانی کو ماہ و سال کے فیتے سے ناپنا بد ذوقی ہوگی اور بدشعاری تو خیر ہے ہی، مجرمانہ فعل بھی ہے۔ میڈم نکہت فراز کے شباب واقعی ہمیں اتنا فراز اور نئی چکنی نظر آئی کہ یقین ہو گیا کہ یہ شباب ابھی کم از کم ساٹھ ستر سال تو ڈھلنے سے رہا۔

مسکراہٹ ان کی شخصیت سے زیادہ ان کے جسم کا حصہ تھی۔

ہم لوگ بی اے کے آخری سال میں تھے۔ بیس طلبا نے فارسی ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لے رکھا تھا۔ بیس میں چودہ لڑکیاں تھیں چھ لڑکے تھے۔ سنسکرت کی طرح فارسی بھی ایک ایسا مضمون ہے۔ جس میں مارکس بہت اچھے آتے ہیں اور ان مارکس کی وجہ سے فرسٹ ڈویژن تو بن ہی جاتی ہے۔ اس لئے جہاں ہندو طلبا شروع سے ہی سنسکرت لیتے تھے، مسلم طلبا اردو اور فارسی لیتے تھے۔ بہرحال میڈم نکہت فراز کے آنے سے کالج کی رونق میں تو اضافہ ہوا ہی تھا۔ ہماری فارسی کی کلاس نہایت بارونق بھی ہو گئی تھی اور نہایت زندہ بھی۔ میڈم پڑھاتی بھی اتنا اچھا تھیں کہ کم از کم ہمارا جی تو یہی چاہتا تھا کہ ساری کلاسیں فارسی کی کلاسیں ہو جائیں۔ ہم سب ان کے فین ہو گئے تھے۔

ظہور کچھ زیادہ ہی فین ہو گیا تھا۔

ہم پانچ لڑکوں اور ظہور میں فرق یہ تھا کہ جہاں ہم پانچوں میڈم کے پڑھانے کے خوبصورت انداز کی بات کرتے تھے........ ظہور ان کی خوبصورتی کی بات کرتا تھا۔ جہاں ہم پانچوں میڈم کی PERSONALITY کی بات کرتے تھے، ظہور ان کے PERSON کی بات کرتا تھا۔ بڑے چٹپٹے اندازے لگاتا رہتا تھا ان کے ''پرسن'' کے بارے میں۔ کلاس میں خوب بولتا تھا، سارا پیریڈ میڈم سے کچھ نہ کچھ پوچھتا رہتا تھا۔ میڈم بے حد خوش مزاج اور خوش اخلاق تھیں۔ اس کی ہر بات کا جواب دیتی تھیں، ہر بات کو EXPLAIN کرتی تھیں۔ لیکن ان کی توجہ صرف ظہور پر ہی نہیں رہتی تھی۔ ساری کلاس ان کی توجہ کا مرکز تھی۔ ظہور نے ایک مہینے کے اندر اندر اپنے ''ارادے'' کا اظہار ہم لوگوں سے کر دیا، اور ہم پانچوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہم پانچوں نے اسے خوب برا بھلا کہا۔ مگر وہ تو جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ ایک دن میڈم عراقی کی ایک غزل پڑھا رہی تھیں۔ ظہور نے ان کی بات کاٹ کر کہا ''میڈم ایک شعر میں نے آج صبح پڑھا۔ مطلب سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ سمجھا دیجئے پلیز''

حالانکہ میڈم کو اس طرح لکچر کے دوران ایک طالب علم کی دخل اندازی اور ایک غیر متعلق بات چھیڑ دینا ناگوار گزرنا چاہئے تھا، مگر ان میں کمال کا تحمل تھا۔ اگر ناگوار گزرا بھی ہو تو انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ بولیں ''شعر پڑھو''

اور ظہور نے شعر پڑھا ۔

ثنائے خود بہ خود کردن نہ زیبد مردِ عاقل را
چو زن پستانِ خود مالد، چہ لذت می شود پیدا

پوری کلاس سناٹے میں آ گئی۔ ظہور بدتمیز اور بے ہودہ تھا، لیکن اس بدتمیزی اور اس بے ہودگی

کی توقع کم از کم اس بے ہودے سے بھی Co-ed کلاس میں کسی کو نہیں تھی۔ لڑکیوں نے بوکھلا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ ہم لوگ بوکھلا کر میڈم کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

میڈم کے چہرے سے تبسم روپوش ہو گیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے ظہور سے کہا ''ظہور تمہارے گھر پہ کون کون ہے؟''

''گھر پہ...... میرے گھر پہ؟'' ظہور کچھ نہ سمجھتے ہوئے ''بولا'' کیوں میڈم؟''

''بتاؤ تو'' میڈم نے بڑی نرمی سے کہا۔

ظہور بولا ''ویل...... میرے گھر پے والد ہیں، والدہ ہیں، تین بہنیں ہیں، دو مجھ سے بڑی، ایک مجھ سے دو سال چھوٹی، ایک چھوٹا بھائی''

''شام کو تو سب گھر پہ ہی رہتے ہوں گے'' میڈم نے بڑی لاپرواہی سے خیال ظاہر کیا ''جی ہاں، شام کو سب گھر پہ ہی رہتے ہیں'' ظہور نے تائید کی اور بولا'' کیوں؟''

میڈم نے کہا ''تو آج شام کو میرا انتظار کرنا۔ تمہارے والد، تمہارے چھوٹے بھائی۔ تمہاری والدہ اور تمہاری بہنوں کی موجودگی میں میں اس شعر کا مطلب بتاؤں گی تا کہ تمہارے ساتھ تمہارے گھر کے دوسرے افراد بھی مستفید ہو سکیں''

''YOU INFERNAL BITCH!'' (جہنمی کتیا) ظہور دہاڑا، اور ہم سب کو دوسرا شاک لگا۔ میڈم نے ایک نگاہ ظہور پر ڈالی اور بڑے نارمل لہجے میں کلاس کو مخاطب کیا ''ہاں تو ہم لوگ عراقی کی وہ غزل Discuss کر رہے تھے۔ اس کا اگلا شعر ہے ؎

چو بہ سوئے کعبہ رفتم، ز حرم رہ نہ دادند   کہ بروں تو چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

اُسی وقت ظہور کھڑا ہو گیا۔ اس نے شعلہ بار نگاہوں سے میڈم کو کئی لمحے دیکھا اور بولا ''YOU SHALL PAY FOR IT.'' (تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا)

''یا تو خاموشی سے بیٹھ جاؤ، یا کلاس سے باہر چلے جاؤ'' میڈم کا لہجہ بڑا نرم لیکن بے حد مضبوط تھا۔ ان کی مسکراہٹ اب تک روپوش تھی۔

ظہور انہیں خونیں نظروں سے دیکھتا ہوا کلاس سے باہر چلا گیا۔

میڈم نے پڑھانا شروع کر دیا۔

ہم میں سے شاید کسی کا بھی دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا

میڈم اس طرح سے جلال الدین عراقی کی غزل پڑھا رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''چو بہ سجدہ سر نہادم......'' کمال کا ضبط تھا اس عورت میں۔

ہم پانچوں لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر لڑکیوں پر نظر ڈالی۔ وہ بھی ہم لوگوں کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ بے حد کبیدہ خاطر بھی نظر آرہی تھیں اور مشتعل بھی۔

''میڈم...... '' ناصر کی آواز ابھری۔ ''یس ناصر......؟'' میڈم رک گئیں اور ناصر کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ان کے چہرے کا تبسم واپس آگیا تھا۔

''میڈم، میرا خیال ہے کہ ہم میں سے کسی کا بھی دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا ہے'' ناصر نے کہا اور ہم سب کی طرف باری باری سے دیکھنے لگا۔

ہم سبھی نے گردن ہلا کر ناصر کی تائید کی۔

''یہ تو کچھ اچھی بات نہیں ہے'' میڈم کی مسکراہٹ کچھ مدھم پڑ گئی۔

''میڈم، ظہور نے جو بدتمیزی کی ہے اس کے لئے ہم سب شرمندہ ہیں'' ہم نے کہا اور پوری کلاس نے ہماری تائید کی۔

''شکریہ...... میرے اچھے دوست'' میڈم نے بڑی فراخ اور بڑی پر خلوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا جس میں سپاس گزاری بڑی وضاحت کے ساتھ عیاں تھی۔ ''بھول جاؤ...... وہ کچھ بگڑا ہوا سا ہے؟...... غالباً اس کی تربیت میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ وقت اسے سمجھا دیگا۔ پھر سب ٹھیک ہو جائیگا''

ہم سب حیرت سے میڈم کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ سب چھوڑئے میڈم'' راحلہ تیز آواز میں بولی۔ ''اس نے دھمکی بھی دی ہے۔ بدتمیز آدمی ہے، کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آپ پرنسپل صاحب سے شکایت کیجئے۔ ہم سب گواہی دینگے''

''یقیناً دیں گے......'' ہم سب نے بہ یک آواز کہا۔

''نہیں...... '' میڈم کی آواز میں سنجیدگی بھی تھی اور مضبوطی بھی۔ ''میں شکایت نہیں کروں گی۔ ہمارے۔ پرنسپل صاحب بہت سخت آدمی ہیں۔ اگر میں نے ظہور کی شکایت کر دی تو اسے کالج سے RUSTICATE کر دیا جائیگا۔ اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ تعلیم کے دروازے اس پر بند ہو جائیں گے۔ یہاں رہ کر تو وہ سدھر سکتا ہے، اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ RUSTICATE ہونے کے بعد تو اس کی اصلاح کے تمام امکانات ہی ختم ہو جائیں گے۔ نہیں...... میں اس کی شکایت نہیں کروں گی''

''اس کا مطلب ہے کہ اس نے جو بدتمیزی کی ہے اس کی سزا اسے نہیں ملے گی'' صادقہ بڑے غصے سے بولی۔ ''نہیں اسے سزا ضرور ملے گی'' میڈم نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''اور وہ سزا کیا ہوگی؟'' خورشیدہ نے بڑے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

میڈم نے بڑی سادگی سے کہا ''معافی''

جوگندر پال

نہیں، رحمٰن بابو

ہاں، بابو، میں نے ساری زندگی ایک اسی کو دھو دھو کر پہنا ہے۔ کیسے حاصل ہوئی؟ بس آپ ہی آپ مل گئی۔ نہیں سنو، بتاتا ہوں، کیسے؟ میں ننگے پنڈے ہی جینے کا عادی تھا، مگر اس گھور رات کو اتنی سردی تھی کہ صبح تک شاید میرا دم نکل جاتا۔ نہیں، بابو، نا معلوم وہ اچانک کہاں سے نمودار ہوئی اور مجھ پر ترس کھاتے ہوئے بولی، لو، مجھے پہن لو!

پروفیسر محمد کاشف حسین

کاک ٹیل کی آہ

آج صبح ہمارے ایک عزیز آئے۔ سلام و دعاء کے بعد انہوں نے مجھ سے ''قومی تنظیم'' میں چھپے ایک مضمون کے متعلق بہت لہک لہک کر اس پر تبصرہ کر رہے تھے وہ بار بار مضمون کے عنوان ''کاک ٹیل کی آہ'' دوہراتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ واہ واہ کرتے جا رہے تھے۔ میں سنتا رہا اور سنتا رہا کیونکہ ''کاک ٹیل کی آہ'' کا عنوان میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا۔ اور عزیزم آہ آہ اور واہ واہ کرتے جا رہے تھے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا آخیر اتنا واہ واہ کرنے کی وجہ کیا ہے۔ ہنستے ہنستے وہ دوہرے بھی ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے گلا پھاڑ کر ہنسنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ ''کاک ٹیل کی آہ'' میں کیا چھپا ہوا ہے۔ یہ سارے سوالات میرے ذہن میں بیک وقت پیدا ہو رہے تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا شاید ''کاک ٹیل کی آہ'' سمجھنے کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے اور عزیزم زیادہ بہتر سمجھ رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا اچھا یہ بتاؤ کہ ''کاک ٹیل'' سمجھتے بھی ہو' تب عزیزم نے کہا سمجھوں گا کیسے نہیں۔ کیا میں بغیر سمجھے ہوئے ہنس رہا ہوں۔ کیا واقعی آپ ''کاک ٹیل'' کا معنی نہیں جانتے۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا ہاں! عزیزم میں نہیں جانتا ہوں' ذرا تم ہی سمجھا دو۔ عزیزم نے کہا کاک ٹیل کا معنی 'مرغے کی دم' ہوتا ہے۔ اور میں عزیزم کو بہت غور سے دیکھتا رہا کہ یہ کتنے اعتماد کے ساتھ بول رہے ہیں 'مرغے کی دم' پھر میں نے ان سے سوال کیا کہ عزیزم ذرا یہ بھی سمجھا دو مرغے کی دم کی آہ کیا ہو سکتی ہے۔ اس کی تشریح کر کے ذرا مجھے سمجھا دو واقعی تمہارا مطالعہ

بہت وسیع ہو گیا ہے۔ عزیزم دائیں بائیں دیکھنے لگے، شاید وہ یہ سوچنے لگے کہ مرغے کی دم کی آہ تو کچھ بیٹھتا نہیں۔ اب میں ان کو کیا سمجھاؤں۔ میں نے عزیزم کی بے بسی محسوس کر لی اور میں آج کے دور کے نوجوانوں کی علمی صلاحیت پر ماتم کناں ہونے گا اور اللہ سے دعا کیا کہ ان نوجوانوں کو ایک اچھی علمی صلاحیت عطاء فرمائے۔

ڈاکٹر ایم نہال

بڑھاپا؟؟؟

جاڑے کی آمد آمد ہے۔ سورج تو کب کا طلوع ہو چکا تھا مگر لحاف کی نرم نرم سی گرمی پاؤں میں بیڑیاں ڈالے تھی۔ اچانک کھانسی کا ایک ریلا آیا جو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ لگا جیسے آنکھیں نکل پڑیں گی۔ کچن کی طرف سے آواز آتی ہے۔

''اجی! سارا دن بستر پر ہی کھانس کر گذارنا ہے۔ باہر آکر دیکھئے کتنی اچھی دھوپ ہے''

تمام عمر جس آواز سے لڑ کر ہارتا رہا آج بھی بادل نخواستہ اٹھا اور چٹائی لے کر چھت پر چلا گیا۔ دور سے طلعت کی مخملی آواز آرہی تھی ۔ یادوں کا سہارا نہ ہوتا ہم چھوڑ کے دنیا چل دیتے

آنکھیں بند مگر ذہن کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ سوچنے لگتا ہوں۔ بڑھاپا کیا ہوتا ہے؟ بچپن کے چھوٹ جانے کا نام یا جوانی کے گذر جانے کا نام۔ گویا یہ خود کچھ بھی نہیں۔ بڑا عجیب سا تصور ہے۔ کہاں تو یہ تجربوں کی آماجگاہ کہلاتا ہے۔ چہرے کی جھریاں زندگی کی تمام تر کہانیاں سناتی ہیں۔ ذہن الجھنے لگتا ہے اور لگتا ہے میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔

علاء الدین حیدرؔ وارثی

شاعری اگر عرفانِ ذات سے تسخیر کائنات تک پہنچ جاتی ہے تو ایسی شاعری اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک نئی گرمی اور یقین کی تمازت سے لبریز نظر آتی ہے اور جب قاری یا سامع ایسی شاعری کو پڑھتا یا سنتا ہے تو ایک عالم بے خودی میں گم ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی شاعری دراصل صوفیانہ شاعری کی معراج سمجھی جاتی ہے۔ علاء الدین حیدؔر وارثی کی شاعری بھی ان جذبوں سے آشنا اور ایسے احساسات سے لبریز تمام تر کیفیات سے ہمکنار نظر آتی ہے۔ ان کا یہ سلیقہ اظہار جذبے کی گرمی اور عرفانی وجدان ان کی شاعری پر محیط کیفیات کا احاطہ کرتے ہیں!......امام اعظم

غزلیں

اے بحر بیکراں مجھے اب تو سنبھال دے
گرداب اور بھنور سے سفینہ نکال دے

کب تک میں دیکھتا رہوں موجوں کے زیر و بم
اس تشنہ کام شوق کو ساحل پہ ڈال دے

سوزِ طلب میں جلتے ہیں منزل کے بھی نشاں
اے یار اپنے حسن کا تھوڑا جمال دے

کیا خوب سج رہے ہیں گلوں پر یہ پیرہن
رعنائیوں کو اب کسی پیکر میں ڈھال دے

حیدرؔ کو بھی عطا ہو دلی منزل مراد
واماندگیِ شوق کی حسرت نکال دے

ہمارے سامنے مایوس ایک پیکر ہے
زباں خموش ہے اس کی نگاہ خنجر ہے

نظر کی بھول ہے یا دل فریب موسم ہے
بہار آنے سے پہلے اداس منظر ہے

ہر ایک گام پہ دیکھا تو مجھ سے آگے تھا
وہ ہم سفر ہے مرا یا کہ میرا رہبر ہے

یہ کس مقام پہ لائی حیات اب تو مجھے
کہ ایک جائے اماں تھی وہ آج محشر ہے

عجیب حال گذرتا ہے مجھ پہ اب حیدرؔ
ہر ایک لمحہ میرا گویا ایک محشر ہے

نظمیں

ڈاکٹر ظفرؔ حمیدی

بانجھ عورت

ایک خوبصورت شجر
پھل عطا کرنیوالا شجر
پھل عطا ہی نہیں کر سکا
کتنے افسوس کی بات ہے
ایک زرخیز اچھی سی مٹی کا کھیت
بیج چھینٹا گیا اس میں ہر فصل میں
پھر بھی حیرت کا ہے یہ مقام
کوئی پودا نہیں اگ سکا
ایک نادر سی، نازک سی، شاخ گلاب
ایک گملے میں بڑھتی رہی
روز موجِ صبا آکے ملتی رہی
اوس امرت لٹاتی گئی
چاندنی لے کے آئی جو نورِ بہار
بلبلیں چہچہانے لگیں
سب کو تھا پھول کا انتظار
اک کلی بھی نہیں کھل سکی
کرب اور بے بسی کی فضا چھا گئی
غم زدہ بانجھ عورت بہت غور سے
سب تماشا یونہی دیکھتی رہ گئی
اس نے محسوس کر ہی لیا
فطرتی ظلم کا بانکپن!

ظہیر غازی پوری

بند آنکھوں کی دنیا

سچ کی ڈور بہت لمبی ہے
اس کا ایک سرا
جب ہاتھ آتا ہے
جی خوش ہو جاتا ہے
حوصلہ دل کا بڑھ جاتا ہے

بند آنکھوں کی دنیا میں
جو کچھ ہے، وہ بھی
لاثانی ہے، دل کش ہے، پیارا ہے
پھر بھی سرابوں جیسا ہے

غور کیا، سوچا، سمجھا تو
کچھ ایسا احساس ہوا
بند آنکھوں کی دنیا میں
وہ سب کچھ ہوتا ہے
جو تم چاہو جو ہم چاہیں

اس دعوے کی
تردید ذرا مشکل ہے
بند آنکھوں کی دنیا لاثانی ہے
خوش منظر ہے!

ذکی احمد

برستی آگ ہے، اٹھتا دھواں ہے

نہ بستی میں نہ جنگل میں اماں ہے ٹھکانہ ان کا زیرِ آسماں ہے
ہے بم باری غریب افغانیوں پر تماشہ دیکھتا سارا جہاں ہے
تباہی، بے کسی و آہ و زاری برستی آگ ہے، اٹھتا دھواں ہے
گھروں میں، مسجدوں میں مدرسوں میں اخوت کا نہیں ملتا نشاں ہے
عمل داری ہے نفرت کی جہاں میں محبت کی عمل داری کہاں ہے؟
مہاجر بن گئے افغان لاکھوں نہ روٹی ہے، نہ کپڑا اور مکاں ہے
گھروں کے ساتھ مسجد بھی کھنڈر ہے مکاں ویراں، مسجد بے اذاں ہے
شریکِ ظلم ہیں اکثر ممالک کوئی نہ ہے سامنے، کوئی نہاں ہے
ذکی ہیں نام کے مسلم ممالک کسی میں غیرتِ ملی کہاں ہے؟
کوئی کرتا ہے مغرب کی غلامی کسی کو اپنی دولت پر گماں ہے
زمانہ ہے مسلماں کا مخالف زمیں ہے تنگ، دشمن آسماں ہے
اگر بندے نہیں انصاف پرور تیرا انصاف اے داور کہاں ہے؟
نہ ساغر ہے، نہ بادہ ہے، نہ ساقی نہیں اس میں کوئی ذکر بتاں ہے
ذکی یہ نظم ہے ایسی کہ جس میں غم و اندوہ افغاں کا بیاں ہے

شمس فریدی

یہ سہمے سہمے پرندے جو چھپ کے بیٹھے ہیں
کوئی اڑے جو کہیں، تیر کا نشانہ بنے
لہولہان تڑپنے لگے وہ دھرتی پر
لچکتی جھومتی شاخوں کے جسم زخمی ہیں
ہرے بھرے یہ چمن زار، یہ حسیں وادی
مہکتی شاخ صنوبر بدن گلابوں کے
بلا و کرب کے تپتے حصار میں جیسے
سلگ رہی ہے ہر اک سمت ایسی چنگاری
جلا کے راکھ نہ کر دے کہیں نشیمن کو
فضا میں زہر یہ کیسا گھلا گھلا سا ہے
نہ احتجاج کہیں ہے نہ انقلاب کی چیخ
تمام پھیلا ہوا ہے سکوت کا عالم
فضا میں ٹوٹتے تاروں کی جگمگاتی لکیر
حیاتِ دشتِ فنا کی خموشیوں میں
اسیر!

احمد سہیل

میں تمہاری ہتھیلیوں میں زندہ رہونگا

میں تمہاری ہتھیلیوں پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں
مجھے معلوم ہے
شام کی گلی سے جنازہ گذرے گا
انجان مردے اس کو کندھا دیں گے
تمہاری آنکھیں دھوئیں کے بادل ہیں
جو روح نہیں بن سکتی
میری روح
تمہارے جسم میں اُگ آئے گی
مگر روح کے پودے کو
درخت...... بننے سے پہلے
تمہاری انگلیاں چاٹ لیتی ہیں

بادل زمین پر آکر
پھر اڑ گیا
چاندانی کے ساتھ اڑے گی
اور سنگھار کرتی لڑکیاں
چکنی مٹی سے چہرہ پوتیں گئیں
درختوں کے تپے
میرا نوحہ گاتے ہوئے
بادل کے ساتھ اڑ جائیں گے
اور میں
زمین پر مر کے بھی نہ مر سکوں گا
میں تمہاری ہتھیلیوں میں زندہ رہوں گا!

سید بشارت علی

معجزہ

کبھی یوں بھی ہوتا
مرے ذہن کی بہتی لہروں پہ
جو روشنی جگمگائی نہیں۔ جگمگاتی
اسے تال سُر سے سجا کر
ہواؤں کے جھونکوں پہ
چاروں دشاؤں میں
مستی کے عالم میں ڈوبے
تھرکتے' تماشے رچاتے' دلوں کو لبھاتے ہوئے دیکھتا
سرخوشی میں
ہراک کوچے کوچے سے رقصاں گزرتا
تو سارے تماشائی مجھ کو
مری روشنی کے
تھرکتے ہوئے دائروں میں گھرے
رقص کرتے ہوئے دیکھ کر
اک نئی شادمانی کی لذت سے مسرور ہو کر
وہ اپنے نہاں خانۂ جاں میں
صدیوں سے سمٹے اندھیرے کو
اک آن میں
روشنی کے بکھرتے ہوئے دائروں میں
بدلنے کا بھی معجزہ دیکھتے!

علقمہ شبلی

منظوم خط بنام طرزیؔ

عالی جناب طرزیؔ رشکِ شباب طرزیؔ

میرا سلام لے لیں دل کا پیام لے لیں
ہے آپ کی عنایت بھیجی جو ایک نعمت
ہے یاد رفتگاں کی تاریخ قائماں کی
تحفہ یہ بے بہا ہے دل کش ہے، دل ربا ہے
گلشن نما شگوفہ دریا نہاں بہ قطرہ
ہر شعر بولتا ہے در فن کا کھولتا ہے
لفظوں میں زندگی ہے شائستہ نغمگی ہے
دیکھیں تو خوبصورت سمجھیں تو بیش قیمت
یہ آپ کا صحیفہ ہے ایک کارنامہ
شعر و ادب کے تارے کتنے ہی ماہ پارے
زیرِ نقاب جو تھے خورشید بن کے چمکے
شبلیؔ کا باب بھی ہے اس سے خطاب بھی ہے
تقلید آپ نے کی شاہِ سخنوراں کی
ہو یہ روش مبارک فن کی خلش مبارک
ہوں معترف قلم کا ممنون ہوں کرم کا
شبلیؔ علقمہ ہوں بندہ خلوص کا ہوں
پابند ہوں وفا کا محتاج ہوں دعا کا

ڈاکٹر عبرت بہرائچی

ہائیکو

میری سن کنگال
بنتا ہے گر دولتمند
کھوٹے سکے ڈھال

اپنا اپنا گھر
سبکو اچھا لگتا ہے
چاہے ہو کھنڈر

رؤف خیر

ترائیلے

ہائی جیک (Hijack)

یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لاکے
یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریف نامحسوس
بنے تھے کیا کیا نہ میں نے حیات کے خاکے
یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لاکے
یہ کون ہے جو مجھے یرغمال ٹھہرا کے
ہوا ہے میری طرح اپنے آپ سے مایوس
یہ کس بدن میں اتارا گیا مجھے لاکے
یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریفِ نامحسوس

شگفتہ جبینی

پیار کا نغمہ

صبح کی ڈھلی کرنیں
شام کا حسیں پیکر
رات کے گھنے سائے
مجھ کو گدگداتے ہیں
چھیڑ چھیڑ جاتے ہیں
پھر ہواؤں کے جھونکے
میرے جسم کو چھوکر
اس کے پاس جاتے ہیں
ان کہی حسیں غزلیں
من گھڑت سے افسانے
خود بخود سناتے ہیں
صبح کی کرن چوموں
شام سے میں یہ پوچھوں
تو بتا کہ رات اس نے
کس جگہ چھوا تجھ کو
رات کے حسیں رخ پر
اس کی یاد کی سرخی
میں لگاتی جاتی ہوں
پیار کا کوئی نغمہ
گنگناتی جاتی ہوں!

شبینہ نوشاد (ام اے انگریزی) ام ایڈ

گیت

سانجھ ہوئی اور ہوا اندھیرا
میں سوچوں گھبراؤں
بن تیرے او ساجن میرے
کیسے رین بتاؤں
آج کا دن تھا اک سپنا سا
پاس تھا میرے کوئی اپنا سا
سوچ کے میں وہ پیاری باتیں
من ہی من مسکاؤں
بن تیرے اوساجن میرے
کیسے رین بتاؤں
پریت میں تری اک جادو ہے
دل تو میرا بے قابو ہے
جی کرتا ہے میں بھی تیرے
سو سو ناز اٹھاؤں
بن تیرے اوساجن میرے
کیسے رین بتاؤں
جیت کے میں تو ہاری تجھ سے
ہار کے تو جیتا ہے مجھ سے
دل یہ چاہے میں یہ بازی
ہردم تجھ سے ہاروں
بن تیرے اوساجن میرے
کیسے رین بتاؤں
دل میں میرے تو بستا ہے
آنکھ میں میری تو رہتا ہے
میرا پیار یہ بولے مجھ سے
میں تجھ میں کھو جاؤں
بن تیرے اوساجن میرے
کیسے رین بتاؤں
ساتھ ہمارا ہے صدیوں کا
ملن تو اپنا ہے جنموں کا
ایسی اچھی، اونچی باتیں
سب کو کیوں بتلاؤں
بن تیرے اوساجن میرے
کیسے رین بتاؤں
ہر دم تیرے ساتھ رہوں میں
ہر پل تیرے پاس رہوں میں
کوئی نہ تجھ کو اتنا چاہے
میں اتنا تجھ کو چاہوں
بن تیرے اوساجن میرے
کیسے رین بتاؤں
ہنستے گاتے جیون بیتے
پیار کا یہ بندھن نہ ٹوٹے
میرے لبوں پہ یہ ہی دعا ہے
اور بتا کیا گاؤں
بن تیرے اوساجن میرے
کیسے رین بتاؤں
تو نے مجھ کو بہت ہے پرکھا
میں نے تجھ کو بہت ہے جانچا
اب نہ جانچوں اور نہ پرکھوں
آ تجھ کو قسم دلاؤں
بن تیرے اوساجن میرے
کیسے رین بتاؤں

ہلال غزالی

فنکاری

کبھی اس سے کبھی اس سے
ہر کسی سے ملتی ہو
ملنا جلنا عیب تو نہیں
لیکن
رسیلے گلابی ہونٹوں پر
مسکراہٹ کے خول میں
زہر ہلاہل چھپائے رہتی ہو
تم بھی تو اوروں جیسی ہو!

شہلا حسن

امس

باہر چھاجوں مینہ برستا ہے
مگر اندر نہ جانے کیوں
امس بڑھتی ہی جاتی ہے!
یہ ہوائیں
جسم و جاں کو چھیدتی...... ہیں
اور
میری روح میں جا کر
پرانے زخم کے
سوکھے کھرنڈوں کو
ادھیڑے ڈالے رہتی ہیں!!!

ڈاکٹر انوری بیگم

ریہرسل

ہمارے نغموں کے
شور و غل
تصویروں کے
آڑے ترچھے خطوط
رقصوں کی
دھما چوکڑی
کہیں
ریہرسل تو نہیں
اُس قیامت کی
آنکھیں جس کی منتظر ہیں!!

تعبیر جہاں

ایک نظم

کئی برسوں سے
سکون کی
کھوج میں بھٹک رہی ہوں
شاید کبھی سکون کا
کوئی موڑ آئے
اور
مرے جسم کو
بے جان کر دے

غزلیں

جگن ناتھ آزاد

میرے ذوقِ بندگی کو حسرتِ یک سجدہ ہے
مجھ کو دے عُمرِ گُریز اں فُرصت یک سجدہ ہے؟

کوئی مانے یا نہ مانے ہم کو اس سے کیا غرض
جلوہ در جلوہ یہ عالم دعوتِ یک سجدہ ہے

تُو نے اے منکر! کبھی اس بات کو سوچا بھی ہے
کس قدر رحمت کی دُنیا دولتِ یک سجدہ ہے

بوالہوس وہ کیفیت در در کے سجدوں میں کہاں
کیفیت وہ، جس کی حامل راحتِ یک سجدہ ہے

تو نے دنیا کو جہنم کہہ دیا سوچا نہ یہ
تجھ کو حاصل بھی اِسی میں جنت یک سجدہ ہے

ہیرا نند سوزؔ

آوارگی میں کوچۂ بسر بھی کچھ نہیں
اور لگ رہا ہے مجھ کو مرا گھر بھی کچھ نہیں

دھرتی بھی مجھ سے چھن گئی اور آسمان بھی
پاؤں تلے بھی کچھ نہیں سر پر بھی کچھ نہیں

دست عمل سے آدمی ہوتا ہے سرخرو
قسمت بھی ہے فریب مقدر بھی کچھ نہیں

خود مملکت فقیر کی اتنی وسیع ہے
اس کے لئے تو تاج سکندر بھی کچھ نہیں

اک میکدے کے سامنے سنئے جناب شیخ
جنت بھی کچھ نہیں جب کوثر بھی کچھ نہیں

اسی حالت جنوں میں تو اس شخص کے لئے
اتنے بڑے ہجوم کے پتھر بھی کچھ نہیں

اس دورِ کاروبار میں لگتا ہے مجھ کو سوز!
بے کار ہیں ادیب سخنور بھی کچھ نہیں

ایوب جوھر

آنکھوں میں آنسوؤں کی کوئی کمی نہیں
کہتے ہو مسکرانے کو یہ دل لگی نہیں ہے

جینے کی طرح میں بھی جیتا رہا ہوں لیکن
کہتے ہیں جسے جینا وہ زندگی نہیں ہے

ہر سمت جدھر دیکھو انسان ہی ملیں گے
بہروپئے ہیں سارے اک آدمی نہیں ہے

شاید ترے کرم سے نا آشنا ہوا ہوں
منظر وہی ہیں سارے کیوں دیدنی نہیں ہے

جاؤں تو کہاں جاؤں اس گورِ غریباں سے
اپنے لئے تو پیارے کہیں قبر بھی نہیں ہے

محمد سالم

آسماں سے اترے ہیں ہم امتحاں کے واسطے
یوں زمیں پر آئے ہیں درد نہاں کے واسطے
زلزلے، سیلاب، طوفاں ہو گئے ہیں آج عام
عہدِ نو ہے غالباً آہ و فغاں کے واسطے
وقت کے سورج سے اب شعلہ فشاں ہے زندگی
درد کی چادر فقط ہے سائباں کے واسطے
سوچتے ہیں ہم یہی احساں میں گذرے عمر قید
رکھتے ہیں درد مندی دو جہاں کے واسطے
لٹ گئی دنیا ہماری جب ہوئے وہ زیرِ خاک
دل بھی ڈوبا بحرِ غم میں جانِ جاں کے واسطے
راز افشا ہو نہ جائے عشق کا سالم کبھی
پیتے ہیں اب خونِ دل رازِ نہاں کے واسطے

شبابؔ للت

شرمائے گا زمانہ میں کھُل کر جب آؤں گا
اپنے حصارِ ذات سے باہر جب آؤں گا
رہنا تم آرتی لئے ساحل پہ منتظر
میں درد کے سفر سے پلٹ کر جب آؤں گا
ہو جائے گا تُو اور بھی مجھ سے بلند تر
بڑھ کر میں ترے قد کے برابر جب آؤں گا
ٹھکرائے گا زمانہ یہ جنسِ گراں مری
لے کر میں فکر و فن کے جواہر جب آؤں گا
اک چیخ بھر کے مجھ سے لپٹ جائے گا وہ جسم
بن باس اپنا کاٹ کے میں گھر جب آؤں گا
آخر مجھی سے آگ بجھے گی عناد کی
گیتوں میں بھر کے پیار کا ساگر جب آؤں گا
پہچان لے گا مجھ کو ہزاروں میں وہ شباب
اگلے جنم میں روپ بدل کر جب آؤں گا

ظفراقبال ظفرؔ

نہیں ہے وہ تو ہر جانب خلا محسوس ہوتا ہے
بدن سے دھوپ کا رشتہ سدا محسوس ہوتا ہے
نہیں واقف کوئی اس کا سبھی نا آشنا اس کے
مگر ہر لب پہ نام اس کا لکھا محسوس ہوتا ہے
کسی کا حسن میری آنکھ میں ایسا سمایا ہے
مجھے چاروں طرف اک آئینہ محسوس ہوتا ہے
طلسمی شہر ہے یا شعبدہ گر لوگ بستے ہیں
یہاں ہر شخص اپنے سے جدا محسوس ہوتا ہے
سبھی کے سر پہ رکھا ہے ظفر اک تاج نخوت کا
عجب بستی ہے ہر انساں خدا محسوس ہوتا ہے

ش.م.عارف ماہرؔ آروی

جو فیصلہ ہوگا وہ سردار میاں جی
آتے ہیں نظر اب یہی آثار میاں جی
غارت گری، لوٹ، زنا اور ڈکیتی
لبریز ہے ان خبروں سے اخبار میاں جی
ہو مولوی، پنڈت کہ کوئی اور کیوں نہ ہو
بے داغ بھلا کس کا ہے کردار میاں جی
ہر شخص یہ چاہے ہے کہ سب کچھ ملے اس کو
باقی ہے کہاں جذبۂ ایثار میاں جی
جی داب کے پی جاؤ کہ یہ زہر نہیں ہے
آنسو کا نہیں کوئی خریدار میاں جی
شاید ہی لڑا ہو کوئی مے خوار سے، میخوار
مسجد میں چلا کرتی ہے تلوار میاں جی
ہو جائیگا جی خوش اگر بھولے سے کبھی کم
پڑھ لوگے جو ماہرؔ کے یہ اشعار میاں جی

محمد علی موجؔ

دوست احباب کے ہاتھوں کا کھلونا ہو جاؤں
اس سے بہتر تو یہی ہے کہ میں تنہا ہو جاؤں
کبھی آنکھیں، کبھی پرتو، کبھی چہرہ ہو جاؤں
آئینے، تو ہی بتا، اور میں کیا کیا ہو جاؤں
مدتیں ہو گئیں بے جان ہوں پتھر کی طرح
تو اگر آن کے چھو لے تو میں زندہ ہو جاؤں
تمکنت کا ہے تقاضہ کہ رہوں سب سے الگ
مصلحت کہتی ہے میں بھیڑ کا حصہ ہو جاؤں
یہ نوازش، یہ عنایت، یہ کرم ہے اُس کا
میں اندھیروں میں رہوں اور اُجالا ہو جاؤں
ناز کی دیکھ کے قاتل کی یہ جی چاہتا ہے
اپنے ہی تیر کا میں آپ نشانہ ہو جاؤں
مسئلہ پیاس کی شدت کا نہیں ہے اے موجؔ
مسئلہ یہ ہے، میں دریا ہوں تو صحرا ہو جاؤں

شگفتہ جبینؔ

کبھی چھونے کی خواہش ہو تو کرنوں میں چلے آنا
مرے رگ رگ میں بس جانا مرے دل میں سما جانا
تمنا مجھ کو پانے کی ترے دل میں کبھی آئے
ذرا پلکیں جھکا لینا مجھے خوابوں میں پا لینا
مری باتیں مری یادیں تمہیں تڑپائیں تو جانم
کبھی غنچوں کبھی پھولوں سے اپنا راز کہہ جانا
سوالوں کی کرے بوچھار جب راتوں کی تنہائی
ہٹانا سر سے تکیہ اور پہلو میں دبا لینا
شگفتہؔ ذرز میں کے واسطے سرگرداں رہتی ہے
کہاں تو چھوڑ آئی ہے محبت بانٹتے رہنا!

پروفیسر علیم اللہ حالیؔ

پھر وہی قصہ وہی باتیں پرانی سامنے
تشنگی ہونٹوں پہ ہے اور اتنا پانی سامنے

زندگی بھر ایک بے منزل سفر کا ساتھ ہے
اب کہاں ہے اُس گئی رُت کی نشانی سامنے

چھینتی جاتی ہے اب ساحل نشینوں کا سکوں
چیختی لہروں کی یہ کف در دہانی سامنے

ذہن پژمردہ، فضا افسردہ، دل ٹھہرا ہوا
اور باہر منظروں کی خوش روانی سامنے

ہم اندھیروں میں ملے تھے یا کہ خوابوں میں کہیں
ایک لمحہ پشت پر، فصلِ زمانی سامنے

ہم کو خود حالیؔ حدیثِ بخد یاد آتی نہیں
یوں تو صحرا کی ہے وہ وحشت ستانی سامنے

جمال الدین ساحلؔ

اب جذبۂ جنوں کے وسیلے نہیں رہے
خیمے لگانے والے قبیلے نہیں رہے

افسانوی ہے صبح بنارس کی تازگی
شام اودھ میں بھی وہ رنگیلے نہیں رہے

دشمن کہاں سے آئے یہاں اسلحوں کے ساتھ
سرحد کے پاسبان جو ڈھیلے نہیں رہے

پنگھٹ کا دور ختم ہوا، باغ کٹ گئے
گاؤں میں بھی وہ چھیل چھبیلے نہیں رہے

ساحلؔ کسی بھی شخص کو آتا نہیں خمار
لمحے خوشی کے بھی تو نشیلے نہیں رہے

پروفیسر افتخار اجمل شاہینؔ

سجا کے لایا ہوں میں نقدِ جاں ہتھیلی پر
کرو قبول یہ ہے ارمغاں ہتھیلی پر
حسین نقشِ حنائی یہ ان کے ہاتھوں پر
سجائے بیٹھے ہیں وہ کہکشاں ہتھیلی پر
بجھے، چراغ ہتھیلی پہ جو جلائے تھے
چراغ چھوڑ گئے ہیں دُھواں ہتھیلی پر
ہمیں پتہ تھا جو انجام اس کا ہونا ہے
جما کے دیکھتے سرسوں کہاں ہتھیلی پر
نشان چھوڑ کے شاہیںؔ گیا ہتھیلی کے
لکھی تھی اس نے بھی اک داستاں ہتھیلی پر

ارشد اقبال آرشؔ

نزدیک بہت ہے وہ مرے قلب و جگر سے
رہتا ہے بہت دور مگر میری نظر سے
ہر گام پہ زخموں کا اک انبار لگا ہے
اس واسطے بچتا ہوں میں الفت کی ڈگر سے
بیٹھا ہوں سرِ راہ گذر آنکھیں بچھائے
گذرے گا کبھی تو وہ مری راہ گذر سے
یادوں کی گھنی بھیڑ میں ہنسنے کا سلیقہ
سیکھے تو کوئی تاروں میں رخشندہ قمر سے
ہے سچ کے قبیلے سے تعلق مرا آرشؔ
سچائی کی آواز اٹھی ہے مرے گھر سے

جمال ہاشمی

سارا منظر بے منظر ہے
لگتا ہے یہ میرا گھر ہے
تیری قربت کا اک لمحہ
صدیوں جینے سے بہتر ہے
سورج خوف سے کیوں لرزاں ہے
اندھیرا میرے اندر ہے
جینا ہے اک مرگِ مسلسل
اب کس کو مرنے کا ڈر ہے
شور بپا ہے جھوٹ کے گھر میں
سچ کے ہاتھوں میں پتھر ہے
راتیں میری خواب گزیدہ
دن میرا روزِ محشر ہے

معذرت و تصحیح: رفتگاں و قائماں کے مصنف کی حیثیت سے مجھے افسوس ہے کہ صداقت بیان کے سلسلے میں ۳-۴ تعلیقات میں کچھ کوتاہی راہ پا گئی۔ ان کی تصحیح کر لی جائے۔

تعلیقہ ۳۷۸۔ محمد مرتضیٰ سنجر کے والد گرامی کا وصال نہیں ہوا ہے الحمد للہ باحیات ہیں۔ اللہ ان کی عمر اور دراز کرے۔ تعلیقہ ۴۳۲۔ ڈاکٹر نور محمد عاجز نے اپنے میڈیکل ایجوکیشن کی تکمیل ایس۔ کے میڈیکل کالج مظفر پور سے نہیں کی بلکہ دربھنگہ میڈیکل کالج سے کی۔ تعلیقہ ۴۷۰۔ قیصر صاحب کے والد کا نام جان عالم ہے۔ قیصر صاحب فی الحال بتیا میں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں انسپکٹر آف اسکولس ہیں۔ تعلیقہ ۵۱۸۔ نصر اللہ جمال نعت گو شاعر عباس سرور کے صاحبزادے ہیں۔ پیشہ معلّمی ہے۔ (عبد المنان طرزی) دربھنگہ کی منظوم ادبی تاریخ "رفتگاں و قائماں" منظر عام پر آ چکی ہے۔ قیمت۔ ۳۰۰ روپئے۔ صفحات۔ ۳۱۲، پتہ۔ محلہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ (فون: ۰۶۲۷۲-۲۳۰۱۴)

پروفیسر نازؔ قادری

اک اندھیرا پھیل کر رنگ شفق سب لے گیا
آسماں پر تھا جہاں تک اس کا حق، سب لے گیا

جس قدر تھی روشنائی آفتابِ فکر کی
رفتہ رفتہ کاتب لوحِ اُفق سب لے گیا

ہے ادھورا سا نصاب زندگی، استادِ وقت
دوستی و دشمنی کے وہ سبق سب لے گیا

وہ ہوا کا ایک جھونکا کس قدر شہہ زور تھا
لالۂ وگل کے صحیفے کے ورق سب لے گیا

خاک بہلائیں گے دل کو اس کی یادوں کے نقوش
جانے والا زندگانی کی رمق سب لے گیا

اٹھ گئی شہر سخن سے رسم سہلِ ممتنع
اک سبک سر میرے افکار ادق سب لے گیا

روشنی بام ودر، برنائی فکر و شعور
نازؔ جن چیزوں کا تھا وہ مستحق سب لے گیا

رئیس الدین رئیسؔ

یوں تو معلوم نہیں خود ہمیں کیا مانگتے ہیں
ہاتھ اٹھا کر سحر و شام دعا مانگتے ہیں

یہ ہرے اور گھنے پیڑ بہاروں کے امیں
سبز موسم سے الگ آب و ہوا مانگتے ہیں

کیا زمانہ ہے کہ سورج کے پجاری بھی یہاں
بجھ چکے ہیں جو چراغ ان سے ضیا مانگتے ہیں

بے گناہی کی سند دے بھی چکی خلق جنہیں
حاکم وقت سے وہ پھر بھی سزا مانگتے ہیں

سر چھپانے کو مکاں پیٹ کی خاطر روٹی
ربِّ کونین سے کیا اس کے سوا مانگتے ہیں

صرف اک میں ہی نہیں بلکہ جو ہیں نامولود
دن نکلتے ہی وہ چوزے بھی چُگا مانگتے ہیں

نقوش نقوی

ہم نہیں اپنی طرح لوگو تو ہم سا کون ہے
ہم اگر جھوٹے ہیں محفل میں تو سچا کون ہے

تو نے دستک سن کے ہی در سے مجھے لوٹا دیا
یہ نہیں سوچا کہ تیرے در پہ آیا کون ہے

جب کہ تو پہلے ہی کے مانند ہے دل میں مرے
پھر بتا مجھ کو مری جاں یہ کہ بچھڑا کون ہے

جس کو بھی دیکھو وہ بھرتا ہے شناسائی کا دم
سب تو اپنے ہیں یہاں لوگو پرایا کون ہے

قربتوں میں فاصلے پیدا کئے کس نے کہو
درمیاں اپنے یہ آنے والی دنیا کون ہے

امتحاں لینا نہیں اپنا ہمیں یوں ہی نقوشؔ
ہم بُروں میں دیکھنا یہ ہے کہ اچھا کون ہے

سیفی سرونجی

مفلس بھی آئینگے یہاں بے گھر بھی آئینگے
تقدیر کے ہزاروں سکندر بھی آئینگے

کس کس کی تاب لاؤ گے تم دوستو یہاں
نظروں میں خونچکاں کئی نظر بھی آئیں گے

نادان سنگریزوں کو بے کار مت سمجھو
ان میں نظر مجھے کئی گوہر بھی آئینگے

منصف مزاج بن کے ذرا غور کیجئے
الزام کچھ تو آپ کے سر پر بھی آئینگے

بخشیں گے ایک دن وہ کئی زندگی مجھے
وہ مرا حال دیکھنے گھر پر بھی آئینگے

سیفیؔ کنارا جن کا ملے گا نہ عمر بھر
راہ وفا میں ایسے سمندر بھی آئینگے

ذکیؔ طارق

بھیگے موسم کی کہانی لکھو
سوندھے آنگن کی زبانی لکھو

اپنے خوشبو سے بدن کو تم بھی
اک ذرا رات کی رانی لکھو

کیوں مہکتے نہیں چہروں کے کنول
خشک ہے آنکھ کا پانی لکھو

جس نے بدلا ہے غزل کا لہجہ
اب بھی زندہ ہے وہ بانی لکھو

ہائے! کیا پیڑ تھا سوکھا کیسے؟
زرد پتوں کی زبانی لکھو

اے ذکیؔ تم بھی نظر سے اپنی
ٹھہرے دریا پہ روانی لکھو

عزیز بگھروی

تیور الگ الگ ہیں تو لہجے الگ الگ
ہر درد کے ہیں اپنے تقاضے الگ الگ

سارے ستمگرانِ جہان تو ہیں اک زبان
لیکن ستم زدوں کے ہیں لہجے الگ الگ

دل کو پسند کچھ ہے نظر کو پسند کچھ
دونوں کی سوچ کے ہیں قرینے الگ الگ

لفظ و بیاں میں لاکھ ہے یکسانیت کا رنگ
مقصد مگر ہیں دیدہ وروں کے الگ الگ

شہر جفا میں سب کا نشانہ ہے ایک دل
چہرے جدا جدا ہیں بہانے الگ الگ

انسانیت کے قصرِ محبت کو توڑ کر
ہم نے بنالئے ہیں گھروندے الگ الگ

کیسی محبتیں ہیں یہ کیسا خلوص ہے
مل کر گلے بھی لوگ ہیں جیسے الگ الگ

ناکام ہوگیا تو کوئی سرخرو ہوا
پھل سب نے پائے اپنے کئے کے الگ الگ

سمتِ سفر عزیزؔ اگر اپنی ایک ہے
رستے ہیں کیوں سفر کے ہمارے الگ الگ

سردار سلیم

یہ دنیا اک تنگ گلی ہے
یہاں پہ کس کی دال گلی ہے

دھڑکن اک سہمی سی آہٹ
دل جیسے سنسان گلی ہے

آنکھیں چھت کو گھور رہی ہیں
نیند کے پیچھے رات چلی ہے

دھوپ جھلکتی ہے بالوں میں
عمر کی پہلی شام ڈھلی ہے

ممتا تو ایمان ہے اس کا
پر بے چاری کوکھ جلی ہے

پروفیسر ایم کمال الدین

جب چل پڑے سفر کو تو پتھر نہیں گنا
تم اپنی پشت پر لگے خنجر نہیں گنا

گنتی ہی جو کرنی ہو تو گن لینا کسی طور
ہشیار! کہ حاشا کبھی لب پر نہیں گنا

بادل کے جھمیلے میں جو سورج کہیں اگ آئے
اس وقت گرد و پیش کے منظر نہیں گنا

جب داؤ پہ ہر چیز ہو اور گھر بھی کھلا ہو
سفاک ساعتوں میں پڑے سر نہیں گنا

ویران اجالوں میں جو تاریکیاں رقصاں ہوں
اوراق پہ چھپّر کے کبھی گھر نہیں گنا

گنتی کے تسلسل کی ضرورت نہیں باقی
اس شخص کو احباب میں تم گر نہیں گنا

ڈاکٹر حنیف ترین

اس کے گلابی ہونٹ تو رس میں بسے لگے
لیکن بدن کے ذائقے بے کیف سے لگے

ٹوٹے قدم قدم پہ جو اپنی لچک کے ساتھ
وہ دلدلوں میں ذات کی مجھ کو پھنسے لگے

تمثیل بن گئے ہیں سمندر کی جھاگ کی
صحرائے غم کی راکھ میں جو بھی دھنسے لگے

جن کا یقین راہِ سکوں کی اساس ہے
وہ بھی گمانِ دشت میں مجھ کو پھنسے لگے

ہم لے کے بے امانی کو جنگل میں آگئے
دل کو جو شہرِ خوباں میں کچھ وسوسے لگے

نعمان شوق

حسن کا اک عجیب عالم ہے
جس قدر چاہوں میں اسے کم ہے

راکھ ہونے میں دیر ہے مجھ کو
لَو ابھی خواہشوں کی مدّھم ہے

بج چکی ایک ہاتھ سے تالی
چھوڑیے بھی اگر وہ برہم ہے

اب اسی میں گلاب بونے ہیں
اب یہی درد میرا موسم ہے

چاہے جتنی بھی روشنی ہوجائے
ایک تارہ تو آج بھی کم ہے

سیدہ نسرین نقاش

زمین سخت ہے اور آسمان پتھر کا
ہے لمحہ لمحہ مرا امتحان پتھر کا

ہمارے شہر پہ کیسا عذاب طاری ہے
مکیں ہے شیشے کا پیکر مکان پتھر کا

دلا رہا ہے مجھے یاد گمشدہ راہیں
نہ جانے کیوں ہوا اب ہم زبان پتھر کا

ذرا سی ٹھیس لگی اور پاش پاش ہوا
تھا برگ گل سے بھی نازک گمان پتھر کا

زمیں کو بخش دو فصلیں اے بادلو! ورنہ
لہو سے ہوگا ادا اب لگان پتھر کا

حیات میں تو نہیں بعد مرگ ہی نسرین
ملا ہے سایہ فگن سائبان پتھر کا

محمد صدیق نقوی

ہماری ذات سے بچھڑا ہے آج سایہ تک
مگر زباں پہ نہیں کوئی حرف شکوہ تک

ہمارا درد بھلا کوئی دور کیا کرتا
ہمارے عہد میں مجروح تھے مسیحا تک

دلوں کی بات کا اظہار ہونٹ کر نہ سکے
یہاں تو جرم ہے سچائیوں کا کہنا تک

ہے موت سے بھی یہاں تیز زندگی کی تپش
جھلس کے رہ گیا جس میں ہر اک ارادہ تک

وہ کیا زمانہ تھا' مشکل تھا وقت کا کٹنا
یہ کیا زمانہ ہے' مشکل ہوا گزارا تک

منافقت کا شجر برگ و بار لایا ہے
خلوص و پیار کا پھیکا پڑا ہے چہرا تک

یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی ہم کو
دلوں کو بھاتا نہیں ہے کوئی تماشہ تک

معبود آمرؔ صدیقی

سوچتا ہوں کیسے پرکھوں کا کھنڈر باقی رہے
ذہن پر بچوں کے یوں کچھ تو اثر باقی رہے

جلد بازی میں تو تم نے کاٹ ڈالے میرے ہاتھ
چاہتے ہو پھر بھی کہ میرا ہنر باقی رہے

ظلم کی چادر میں لپٹا میرے حاکم کا وجود
پھر بھی میں سچ بول کر سمجھوں کہ سر باقی رہے

وقت کا حاکم ہوں مجھ کو دوسروں سے کیا غرض
ملک جل جائے تو کیا ہے اپنا گھر باقی رہے

زندہ قوموں کی طرح یہ عہد کرلو دوستو
منزلیں ملتی رہیں پھر بھی سفر باقی رہے

لاڈلی بیٹی کی رخصت پر تھی والد کی دعا
میرا سب کچھ بک گیا بیٹی کا گھر باقی رہے

یہ بھی ممکن ہے کہ اب کے آندھی کچھ ایسی چلے
پتیاں جھڑ جائیں ساری اور ثمر باقی رہے

دل کا آنگن بانٹ کر آمرؔ یہ کیسے سوچتے
گھر کا بٹوارہ نہ ہو دیوار و در باقی رہے

مشکور حسن علی نگری

کہاں چین دیتے مجھے شور بختاں
رہے پیچ کھاتے مرے دل کے ارماں

یہ رودادِ غم ہے مری زندگانی
جیا اس جہاں میں بحال پریشاں

کدھر سے میں گذروں کہاں سر چھپاؤں
بہر سمت بکھرے ہیں خار مغیلاں

مخاطب ہوں ان سے خدارا وہ سنبھلیں
جلاتی ہے دنیا کو آہ غریباں

یہی بے رخی ان کی کم تو نہیں ہے
لہو رو رہا ہوں وہ ہیں لب بخنداں

بہر سمت ہے زور بادِ مخالف
کہیں بجھ نہ جائے یہ شمعِ فروزاں

بیتابؔ اختر

پتوار کسی کام کی پتوار نہیں ہے
دریا میں جو مانجھی کی مددگار نہیں ہے

بگڑی ہوئی حالت نے بنی بات بگاڑی
رہنے کو مجھے اب کہیں گھربار نہیں ہے

مالی کے تغافل کا نتیجہ یہی نکلا
گلزار جو پہلے تھا وہ گلزار نہیں ہے

میں کچھ بھی کہوں گا تو مری کون سنے گا
جب میرا یہاں کوئی طرفدار نہیں ہے

اُس چشم کے اشکوں میں اثر کچھ نہیں بیتابؔ
جو دل کے لہو سے ابھی خونبار نہیں ہے

نظر اپنی اپنی

(تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

نام کتاب: ''قصہ شناسی'' مصنف: ڈاکٹر قاسم فریدی۔ قیمت: ۸۰ روپے۔
صفحات: ۱۲۸۔ ناشر: قاضی علی حق اکیڈمی، سہسرام۔ مبصر: پروفیسر نادم بلخی، ڈالٹین گنج (جھارکھنڈ)

ڈاکٹر قاسم فریدی آج کے ابھرتے ہوئے بہار سے تعلق رکھنے والے ناقد ہیں، جن کی ایک کتاب بعنوان ''قصہ شناسی'' حال ہی میں دستیاب ہوئی۔ اس کتاب میں مجموعی طور پر دس مضامین ہیں اور اس کی ایک مختصر تقریظ پروفیسر علیم اللہ حالی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے ''اعتراف'' کی سرخی کے تحت قاسم فریدی صاحب کی بھی ایک تحریر ہے جس میں انہوں نے اس کتاب سے تعلق رکھنے والے مواد کے تنقیدی جائزے پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد ان حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے جن کے خلوص اور محبت کا نتیجہ اس کتاب کی اشاعت کی صورت میں نکلا ہے۔ کتاب میں شامل دس مضامین کا تعلق اردو فکشن کے رموز و نکات اور اس کے اہم فنکاروں کی تخلیقات کے تنقیدی جائزے سے ہے۔ پہلا مضمون۔ 'اردو افسانہ کل سے آج تک' ہے جو اردو افسانے کے ارتقا کا ایک منظر نامہ ہے۔ دوسرا مضمون 'کہانی کار اور مقصدیت' ہے۔ جس میں کہانی کار اور اس کی تخلیقات کے مقاصد کو مدنظر رکھ کر کہانیوں کی تکنیک سے متعلق ضروری باتیں کہی گئی ہیں۔ ساتھ ساتھ پریم چند سے لے کر آج تک جو صف اول کے افسانہ نگار ہمارے سامنے ہیں ان کے فن پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا مضمون 'پریم چند کی حقیقت نگاری' ہے۔ جس میں پریم چند کی صرف افسانہ نگاری کو ہی نہیں بلکہ ان کی ناول نگاری کو بھی مدنظر رکھ کر ان کی آفاقی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد کا مضمون اردو افسانہ اور ناول کی ایک قد آور شخصیت سہیل عظیم آبادی کی فنکاری کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ جنہیں اردو افسانہ نگاری میں خصوصی طور پر پریم چند کا جانشیں کہا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ اس میں نہ صرف سہیل کے افسانوی مجموعے ''الاؤ'' وغیرہ کو ہی مدنظر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ان کا مشہور ناول ''بے جڑ کے پودے' کا بھی ناقدانہ جائزہ ایمانداری کے ساتھ لیا گیا ہے نیز ان کے طویل مختصر افسانوی مجموعے ''چار چہرے'' کے چاروں معرکۃ الآرا افسانوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

شکیلہ اختر کی حیثیت بھی افسانہ نگاری کی تاریخ میں اہم ہے اور ان کے شاہکار اور

نمائندہ افسانوں کے پیش نظر ان کی افسانہ نگاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔

غیاث احمد گدی دور جدید کے ایک بڑے افسانہ نگار گذرے ہیں اور ناول نگاری میں بھی ان کی دین ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا بھی ناقدانہ جائزہ یہ کتاب پیش کرتی ہے۔

ڈاکٹر حسین الحق فی زمانہ اردو فکشن کی دنیا میں ایک قد آور شخصیت ہیں۔ ان کے فن کا محاسبہ کرتے ہوئے صاحب مضمون نے ان کی دین کا بھرپور اور کارآمد جائزہ لیا ہے۔ اس لئے کہ جائزہ لیتے وقت ان سے متعلق آج کے معروف ناقدین کی آراء و تاثرات کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم مضمون 'اردو کے چند اہم ناول' ہے یہ مضمون پڑھنے کے بعد تشنگی ضرور محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ اردو کے جو چند اہم ناول نگار خصوصی طور پر دورِ جدید سے تعلق رکھنے والے ہیں' ان کے ناولوں کا بھرپور جائزہ نہیں لیا گیا ہے جن کی حیثیت ناول نگاری کے میدان میں سنگ میل کی سی ہے۔

''بے جڑ کے پودے'' کو مدنظر رکھ کر سہیل عظیم آبادی کے فن کا جائزہ لیتے وقت اختر اورینوی کے ناول 'حسرتِ تعمیر' کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے اور یہ ضروری تھا اس لئے کہ دونوں کے مواد کا تعلق چھوٹا ناگپور کی قبائلی زندگی سے ہے۔

'بولو مت چپ رہو' کی اشاعت نے بحیثیت ناول نگار حسین الحق کی فنکاری کو طشت از بام کیا ہے اور اس پہلو کو مدنظر رکھ کر ایک اچھا مضمون لکھا گیا ہے۔

میں نے یہ کتاب پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ برآمد کیا کہ اردو فکشن کے مصنف نے گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کے تحت جو کل اور آج کے اہم فنکار گذرے ہیں ان میں خاص طور پر بہار سے تعلق رکھنے والے زیادہ ہیں اور اس طرح بہار کی اردو فکشن کو جو دین ہے یہ کتاب اسے پوری طرح واضح کرتی ہے۔ عام قاری کے لئے بھی یہ ایک مفید کتاب ہے اور ساتھ ساتھ کالج اور یونیورسٹی کے طلبا کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے اس لئے کہ کئی ایسے فنکار ہیں جو نصاب میں داخل ہیں۔ ڈیمائی سائز پر دیدہ زیب سرورق اور کمپیوٹر کی کتابت وطباعت نے اس کتاب کو خوبصورتی عطا کی ہے۔ میں اس کتاب کے مصنف کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

نام کتاب: ''تذکرہ مہدانواں'' مصنف: ڈاکٹر سید شاہد اقبال ۔ قیمت: ۶۰ روپے۔

صفحات:۹۶۔ اشاعت:۲۰۰۰ء۔ رابطہ:' آستانۂ حق' نیو کریم گنج، گیا۔ مبصر: ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی' گیا

اپنے مشاہیر علما، فضلا اور ادبا کو یاد کرنا اور ان کے کارناموں کو تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر دینا ایک ایسی گراں قدر علمی اور تحقیقی خدمت ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ ایسا کام کرنا دراصل اپنی تہذیبی اور ثقافتی جڑوں کو مضبوط کرنا ہے۔ عظیم آباد کی بستی مہدانواں بڑی مردم خیز مانی جاتی ہے۔ اس نے علم و ادب کے میدان میں ایسی نامور شخصیتیں پیدا کی ہیں جن کی خدمت بھلائی نہیں جا سکتی لیکن انسانی حافظہ کو کہاوت میں بھی کمزور ہی بتایا گیا ہے اس لئے تحقیقی کاوشوں کے ذریعہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو محفوظ کر لینا انتہائی اہل اور ضروری کام ہے۔ ہمارے نوجوان مگر ہونہار محقق ڈاکٹر شاہد اقبال نے تذکرۂ مہدانواں جیسی تصنیف پیش کر کے یہ خدمت بخوبی انجام دی ہے۔ مہدانواں سے متعلق بعض ایسے گوشے اور پہلو جو سماجی اور تہذیبی اعتبار سے اہم ہیں لیکن عام لوگ ان سے ابھی تک ناواقف تھے اس تصنیف کے ذریعہ نمایاں طور پر سامنے آ گئے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد اقبال کو مواد کی فراہمی میں جن مشکلوں سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ کچھ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جنہیں خود ان راہوں کا تجربہ ہو۔ لگن، محنت اور دیدہ وری کی بدولت انہوں نے عظیم آباد کے ایک ایسے علمی و ادبی مرکز کی یاد تازہ کر دی ہے جس کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔ ڈاکٹر شاہد اقبال نے اپنے موضوع کو بڑے دل نشیں پرایہ اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے خوبصورت طرز اظہار نے کتاب کی دلکشی میں بے حد اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے تحقیقی کاموں کو دیکھتے ہوئے ان کے درخشاں مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نام کتاب: قنطار۔ صفحات:۱۱۲۔ مترجم: رؤف خیر۔ قیمت: سو روپے، مبصر: ڈاکٹر منصور عمر

علامہ اقبال کا شمار دنیا کے چند عظیم فنکاروں میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی بیشتر زبانوں میں ان کے کلام کے ترجمے ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

''پیام مشرق'' علامہ اقبال کی وہ مایہ ناز فارسی تصنیف ہے جو مشہور جرمن مفکر گوئٹے کی معروف تصنیف ''دیوان مغرب'' (West Ost Licher Divan) مطبوعہ ۱۸۱۹ء کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ پیام مشرق کی تصنیف ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۳ء کے درمیان ہوئی۔ یہ وہ دور ہے جب ۱۹۱۹ء میں افغانستان کے امیر حبیب اللہ خاں کے قتل کے بعد ان کے بیٹے امیر امان اللہ خاں تخت نشیں ہوئے اور انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ انگریزوں کو مجبوراً افغانستان

سے صلح کرنی پڑی۔ اسی لئے اس کتاب کا انتساب اقبال نے امیر امان اللہ خاں کے نام کیا اور سات بندوں پر مشتمل ۸۱ اشعار کی ایک طویل نظم پیش کی۔

"پیام مشرق" پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب رباعیات موسوم بہ لالۂ طور ہے اس حصہ میں ۱۶۳ رباعیات (قطعات) ہیں۔ رؤف خیر نے اس پہلے باب لالۂ طور کا منظوم اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ "حرف خیر" کے تحت رؤف خیر لکھتے ہیں:۔

(۱) میں نے یہ جو "لالۂ طور" کے عنوان کے تحت "پیام مشرق" میں شامل علامہ اقبال کی رباعیات کا منظوم ترجمہ کردیا ہے وہ ارباب نظر کی نذر ہے۔"

(۲) پیام مشرق کا ایک بڑا حصہ "لالۂ طور" سے جو ۱۶۳ قطعات پر پھیلا ہوا ہے، ناچیز نے اس غالب حصے کا ترجمہ قطار کے نام سے کرنے کی جسارت کی ہے۔"

(۳) انا میری شمیل...... نے اپنی کتاب "Gabricl's Wing" میں لالۂ طور کی رباعیات کی شرح کرتے ہوئے اقبال کے فکروفن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔"

مذکورہ اقتباسات پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ لالۂ طور کو دو جگہ رباعیات کہا گیا ہے اور ایک جگہ قطعات۔ جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ لالۂ طور کی صنفی حیثیت کے سلسلے میں رؤف خیر کا ذہن صاف نہیں ہے کہ وہ رباعیاں ہیں یا قطعات کیونکہ پیام مشرق میں بھی اسے رباعیات ہی کہا گیا ہے۔ اور کالیداس گپتا رضا حرفے چند کے تحت اسے قطعات کہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "انہوں نے ......لالۂ طور (قطعات) کا ترجمہ جو آپ کے سامنے ہے، بڑے شوق اور انہماک سے کیا ہے" البتہ "قطار ایک قابل قدر پیش کش" کے تحت ڈاکٹر تسخیر فہمی نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ "اسی فارسی شاعری کا ایک طویل باب "لالۂ طور کے نام سے قطعات پر مشتمل ہے۔ ان قطعات کو رباعی کا نام دینا لغوی اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے۔ مگر اصطلاحی لحاظ سے بالکل غلط ہے۔" اور یہی بات صحیح بھی ہے۔ کیونکہ اردو اور فارسی شاعری میں رباعی کیلئے جو اوزان مقرر کیے گئے ہیں ان میں سے بارہ شجرۂ اخرب کے ہیں اور بارہ شجرۂ اخرم کے۔ گویا لالۂ طور کی شاعری قطعات پر مشتمل ہے نہ کہ رباعیات پر۔

ہاں! تو بات وہاں سے چلی تھی کہ "پیام مشرق" کے پہلے باب لالۂ طور کے فارسی قطعات کا رؤف خیر نے منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کے سلسلے میں عموماً یہ بات کہی جاتی ہے کہ فلاں ترجمہ پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے نیز یہ کہ اس میں بڑی روانی اور سلاست ہے۔ حالانکہ ترجمہ متن

سے ہمیشہ کم تر ہی ہوگا کیونکہ بقول جمیل جالبی ''مترجم کی ذات مصنف کی ذات سے ہمیشہ کمتر رہتی ہے۔ برخلاف اس کے مصنف کی شخصیت ترجمہ کے ذریعہ پھیل کر اور بڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی بات ہوتو آدمی جس طرح چاہے اس کا اظہار کردے۔ لیکن ترجمہ میں آدمی بندھ کر رہ جاتا ہے۔ مصنف کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ اگر اس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو اصل سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کے بالکل مطابق رہنے کی کوشش کی تو بیان میں اجنبیت در آتی ہے۔ جملوں کو توڑ کر اپنے طور پر بیان کرنیکی کوشش کی تو اس کی زبان بیان اظہار کے نئے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسے میں مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ دوسری زبان کے اظہار کو اپنی زبان کے اظہار سے قریب تو لائے اور مصنف کے لہجے اور طرز ادا سے اپنی زبان میں ایک نئے اسلوب کے لئے راہ ہموار کرے''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ کا کام کتنا مشکل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ رؤف خیران تمام دقتوں کے باوجود ترجمہ کے کام سے پوری طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ترجمہ کا کام اگر مشکل ہے تو منظوم کلام کا منظوم ترجمہ مشکل ترین امر ہے۔ رؤف خیر نہ صرف یہ کہ اردو اور فارسی زبان پر یکساں قدرت رکھتے ہیں بلکہ اقبال کے فکر و فلسفہ کو بھی انہوں نے پوری طرح سمجھا ہے اور اردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ چونکہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی تہذیب ایک دوسرے سے بیحد قریب اس لئے رؤف خیر کو ترجمہ کے دوران کچھ سہولت ضرور ہوئی۔ ترجمے کے دوران ''کہیں کہیں مصرعوں کو موخر و مقدم کرلیا ہے تا کہ ترجمے کا حسن مجروح نہ ہونے پائے۔'' مثلاً

همه رازم جهان راز جویم — نه سن انجام و لے آغاز جویم
هماں برگ مگر را باز جویم — گراز روئے حقیقت پردہ گیر نه

ترجمہ: جہان دار، ڈھونڈوں راز ہو کر — نہ میں انجام نے آغاز ڈھونڈوں
اگر ظاہر ہو بے پردہ حقیقت — مگر ''شاید'' کا پھر انداز ڈھونڈوں

ترجمہ کے دوران دوسرے مصرعہ کو پہلے لایا گیا ہے اور پہلے کو بعد میں۔ اس ترجمہ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ متن اور ترجمہ دونوں ایک ہی بحر میں ہیں۔ نیز یہ کہ ترجمہ سے پہلے انہوں نے متن بھی نقل کر دیا ہے تا کہ قارئین موازنہ کر کے دیکھ لیں کہ ترجمہ کتنا کامیاب ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ترجمہ نے اصل کا روپ دھار لیا ہے اور اس لحاظ سے اس ترجمہ کو نہ صرف یہ کہ قابل قدر تصور کیا جائے گا بلکہ اس کے ذریعہ لالۂ طور اور علامہ اقبال کو

سمجھنے میں مدد ملے گی۔اور رؤف خیر کی اس کوشش کو مستحسن نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

نام کتاب: ''آواز کے سائے''۔شاعر: ڈاکٹر عبید الرحمٰن۔ قیمت: ۱۲۰ روپے

سال: ۲۰۰۱ء۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ مبصر: ظفر عدیم، دہلی۔

شاعری صرف یہ نہیں ہے کہ جذبات و احساسات کو ترتیب و تقسیم اور نشست و برخاست کی ترکیب سے الفاظ کے مخصوص سانچے میں ڈھال دیا جائے بلکہ شاعری بیرونی عناصر کی وہ کائنات ہے جس میں غنائیت کا ازلی عنصر موجود ہوتا ہے اس لئے شاعری ایک فنی خلاقی ہے اور جناب عبید الرحمٰن کی شاعری میں وہ کائنات محسوس ہوتی ہے اور اس فنی خلاقی کا احساس ہوتا ہے ڈاکٹر عبید الرحمٰن کے مجموعۂ کلام 'آواز کے سائے' کے مطالعے سے فوری تاثر یہ ملتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس خلقی عنصر کے قریب پہنچ کر اپنے وجود کی از سرِ نو تشکیل و تنظیم میں کامیاب ہو چکے ہیں اور اس طرح انہوں نے اپنے اندر کے فنکار کو دریافت کر لیا ہے۔

جناب عبید الرحمٰن کی شاعری کی ایک کلیدی خاصیت 'تحقیق پسندی' ہے۔انہوں نے کہنہ روایات سے استفادہ کیا ہو یا مبدّل اقدار سے، جو توازن قائم رکھا ہے وہ اسی تحقیق پسندی کی دلیل ہے اور اس کی نمایاں جھلک مجموعہ کلام کے نام (آواز کے سائے) میں ملتی ہے۔میرے نزدیک یہ آواز Sound اور Voice نہیں بلکہ Soul اور Virtue ہے اور سائے کو میں پرچھائیں یا انعکاس نہیں بلکہ (Persuit (S سمجھتا ہوں۔(Persuit (s) of soul (or Virtue کی یہ کیفیت 'آواز کے سائے' میں شامل بہت سے اشعار میں نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔اس کیفیت کو میں عبید کی ذہنی (فطری) پختگی (اختراعیت) تصور کرتا ہوں۔اشعار دیکھیں۔

مرے لہو سے بہاروں کی آبرو ہے عبید	مری نوا سے فروزاں ہر اک جگر کا چراغ
کسی منزل پہ ٹھہرنا نہ کہیں دم لینا	ہم مسافر ہیں مقدر میں ہمارے ہے سفر
عجب تضاد بھری کیفیت وجود میں ہے	شدید دھوپ بھی ہم سائبان بھی ہم ہیں
بن جائیں نہ تصویرِ فنا بچے ہمارے	تاریخ کو اب اور نہ تلوار پہ لکھیے

مجموعی طور پر میں جناب عبید کی شاعری کو آج کے دور میں غنیمت سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی 'فکر' اور سنجیدہ پذیرائی' پر انحصار کیا ہے جو آج نئی نسل میں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔بجا طور پر امید کی جا سکتی ہے کہ مجموعہ کلام ''آواز کے سائے'' کو ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوگی۔

راہ و رسم

نقی احمد ارشاد، پٹنہ : آپ کا ادب نامہ "تمثیل نو" ملا۔ سرورق دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ خدا کرے یہ رسالہ قائم رہے۔ کھگڑا میلا ۱۹۵۵ء خوب ہے۔ "دربھنگہ کی منظوم تاریخ" نہایت خوب ہے اور مردوں کو زندہ رکھنے کی اچھی کوشش۔ میں مدھوبنی میں زمانہ نومبر ۱۹۵۴ء سے نعایت دسمبر ۱۹۵۹ء تک رہا۔ وہیں عارضی ایس۔ ڈی۔ او۔ بھی تھا۔ پھر دربھنگہ خاص لہیر یا سرائے میں جولائی ۱۹۶۷ء سے نعایت جنوری ۱۹۷۱ء تک رہا۔ وہیں ترقی پا کے اے۔ ڈی۔ ایم ہوا اور شاہ آباد آرہ چلا گیا۔ دربھنگہ میں امیر حسن مرحوم مظہر امام صاحب سے اور قدیر انصاری مرحوم ڈاکٹر سے دوستی رہی۔ وہاں کے مسلمان بڑے خوش اخلاق اور ہمدرد ہیں۔ یہ بات میں نے کسی دوسری جگہ نہیں پائی۔ ۸۴ سال کی عمر ہو رہی ہے اور زیادہ لکھنے پڑھنے سے تکلیف ہوتی ہے آپ کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر چند سطریں بطور رسید رسالہ لکھ دیں۔ اللہ آپ لوگوں کو خوش و خرم رکھے۔

پروفیسر مختارالدین احمد آرزو، علی گڑھ : "تمثیل نو" کا شمارہ ۳ موصول ہوا۔ حسن ادارت اور حسن طباعت دونوں کی داد دیتا ہوں۔ یاد آتا ہے کہ آپ کو پرویز شاہدی کا کچھ ابتدائی کلام بھیجا تھا اس عہد کے ان کے بہت سے اشعار غیر مطبوعہ رہ گئے ہیں۔ اکمل یزدانی صاحب کے مضمون میں ۱۹۵۵ء کے ایک مشاعرے کے سلسلے میں دو شاعروں قاسم پانی پتی اور رنجور عظیم آبادی کا ذکر ہے۔ بہار کے لوگ انہیں بالکل بھول گئے۔ مانا کہ ان کی وفات کو نصف صدی گذر گئی لیکن ارباب وطن ایسے لوگوں کو کبھی تو یاد کر لیا کریں سید محمد قاسم مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں میرے ہم سبق تھے۔ یہ شاد عظیم آبادی کے شاگرد اور عزیز شائق عظیم آبادی کے صاحبزادے تھے۔ اصلاح غالباً اپنے بھائی نصیر عظیم آبادی سے لیتے تھے اور شاعری کے فنی نکات اپنے والد سے سیکھتے تھے۔ قاسم مشاعروں میں تحت اللفظ میں شعر پڑھتے تھے۔ آواز ان کی بلند تھی۔ ان کے اجداد پانی پت سے آکر محلہ نون گولہ پٹنہ سیٹی میں شاد مرحوم کے مسکن کے قریب آباد ہو گئے تھے۔ متعدد بار اس وسیع مکان میں سید محمد قاسم سے ملنے جانا یاد آتا ہے ان کے والد شائق اور ان کے بھائی سید نصیر عظیم آبادی نصیر کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ رنجور عظیم آبادی کا نام سید محی الدین ہے۔ یہ ساغر نظامی کے تلامذہ میں تھے اور اس زمانے

میں (۱۹۳۵ء کے لگ بھگ) اپنے نام کے ساتھ ساتھ ساغری لکھتے بھی تھے۔ ذہین آدمی تھے اور بڑے مخلص دوست سید محمد فخر الدین مرحوم سابق وزیر تعلیم کی کوٹھی کے ایک حصے میں قیام پذیر تھے۔ میٹرک سے آگے نہ پڑھ سکے۔ ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ کشن گنج میں کچہری میں ملازم ہو گئے ہیں۔ میں علی گڑھ سے پٹنہ جاتا تھا تو کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ یہ میرے بچپن کے احباب عبدالقیوم قائد، قیوم اثر، افضال قدو وغیرہ کے دوستوں میں تھے۔ اچھی صلاحیت کے نوجوان تھے۔ ان کے اس طرح ضائع ہونے کا افسوس رہا۔ ان کی تحریر بہت خوبصورت ہوتی تھی۔ اور شعر بہت اچھے کہتے تھے۔ ساغر صاحب نے اپنے رسالہ ایشیا (میرٹھ) میں ان کے کچھ افکار نظم ونثر شائع کئے تھے۔ اللہ ان سید قاسم پانی پتی ثم عظیم آبادی اور سید محی الدین احمد رنجور فاطمی دونوں کی مغفرت فرمائے اور ان کی تربت ٹھنڈی رکھے۔ آمین۔

جوگندر پال، دهلی: لیجئے، آپ کی خواہش کی تعمیل میں اب اس قابل ہو گیا ہوں کہ ''تمثیل نو'' کے لئے کوئی نئی تحریر بھیجوں۔ ''نہیں رحمٰن بابو'' کے عنوان کے تحت چھ نئے افسانچے حاضر ہیں۔

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، علی گڑھ: ''تمثیل نو'' کا تیسرا شمارہ ہم دست ہوا۔ شکریہ۔ خوشی کی بات ہے کہ رسالہ پابندئ وقت سے نکل رہا ہے۔ امید ہے اسی طرح نکلتا رہے گا اور معیار برابر نکھرتا رہے گا۔ دربھنگا کی منظوم تاریخ بڑی دیدہ وری اور محنت کا کام ہے اور اس کے حواشی اور زیادہ قابل تعریف ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری کا جائزہ جس نقطۂ نظر سے لیا گیا ہے وہ ان کی شاعری کے حقیقی جوہر کو بخوبی اجاگر کرتا ہے۔

پروفیسر رفیع الدین هاشمی، لاهور: ''تمثیل نو'' کا (پہلا تو نہیں) دوسرا شمارہ ملا ممنون ہوں کہ آپ نے زحمت کی ارسال کرنے کی، اور ایسا اچھا پرچہ مطالعہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ پروفیسر منصور عمر صاحب کی مثنوی پر مطیع الرحمٰن صاحب کا مضمون، موضوع مثنوی اور صاحب مثنوی کا بہت اچھا تعارف ہے۔ طرزی صاحب نے جس اختصار سے دربھنگا کی ادبی تاریخ کو مثنوی کی شکل دی ہے، وہ بہر اعتبار قابل تحسین ہے۔ حواشی نے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ مناظر عاشق صاحب کے مضمون میں انگریزی الفاظ کی کثرت نے مضمون کو اور بھی گاڑھا بنا دیا ہے۔ منصور عالم صاحب نے (خواجہ احمد فاروقی پر) خلیق انجم صاحب کے لیکچر پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ لیکچر میری نظر سے بھی گزرا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی مرحوم کی شخصیت کو بڑی جامعیت سے متعارف

کرایا گیا' مگر لیکچر کی اضافی خوبی یہ ہے کہ اس سے خود خلیق انجم کی شخصیت کے بعض گوشے بھی نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ میری دعاء ہے کہ خدا آپ کو ہمت و توفیق دے کہ رسالہ باقاعدگی سے شائع کرتے رہیں اور معیار بھی برقرار رہے۔

علقمہ شبلی، کولکاتہ : ''تمثیل نو'' شمارہ ۳ موصول ہوا۔ آپ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں' سارے مشمولات توجہ کے طالب ہیں۔ اکمل یزدانی نے کھگوامیلہ مشاعرے کی ایک جھلک دکھا کر بہت سی یادیں تازہ کر دیں۔ دربھنگہ کی منظوم ادبی تاریخ کی یہ قسط بھی معلومات افزا اور دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر ظفر حمیدی، مظفر پور: ''تمثیل نو'' کا تیسرا شمارہ بصارت نواز ہوا۔ اس شمارے کے Cover کا سادہ تیور ہی چونکا دینے والا ہے۔ بہت خوب مشمولات کے مطالعہ سے مجھ پر یہ تاثر قائم ہوا کہ یہ رسالہ اب ''دربھنگویت'' کی گرفت سے آزاد ہو کر ''بین الاقوامیت'' کے افق پر چمک رہا ہے۔ یہ کایا پلٹ تمہاری کاوش کے اخلاص اور رسالہ کی خوش بختی کی غماز ہے۔ عزیزم پروفیسر طرزی دو شماروں پر حاوی رہے۔ بڑا کام ہوا۔ برادر محترم پروفیسر مختار الدین احمد آرزو خود بھی اپنی خود نوشت کا سلسلہ جاری کر سکتے ہیں' پروفیسر خورشید الاسلام' اسلوب احمد انصاری' زیدی بہنیں اور دوسرے سبکدوش دانشوران علی گڑھ سے تعاون دلا سکتے ہیں۔ ''تمثیل نو'' کے توسط سے میری ان سے یہ درخواست ہے۔

پروفیسر عبدالوہاب اشرفی، پٹنہ : رسالہ ''تمثیل نو'' ملتا رہا ہے۔ اس رسالے کے محتویات کو دربھنگے اور اس کے نواح سے نکلنا چاہئے۔ مقامی ادیبوں اور شاعروں کو ساتھ رکھئے لیکن دائرہ بڑھتا رہے تو بہتر ہے۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی کی نظم خاصی اہم ہے' اس اہم تخلیق سے ریسرچ کے مزید دروازے وا ہوتے ہیں۔

شارق جمال ناگپوری، ناگپور : ''تمثیل نو'' کا شمارہ ۳ ملا۔ معروف تخلیق کاروں کی شمولیت نے اس رسالے کے معیار کو اونچا کیا ہے۔

کھگوامیلہ مشاعرہ ۵۵ء کی ایک جھلک میں اکمل یزدانی صاحب نے اس علاقے کی پچھلی ادبی کارکردگی کا بھی ذکر برسبیلِ تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ ''دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ'' نہایت سلیس زبان میں ہے۔ حواشی سے بھی اس شہر کے شعراء و ادباء کی کافی تفصیلی معلومات

احاطۂ تحریر میں آ گئی ہیں۔ پروین شاکر کی نسائیہ شاعری کا تجزیہ بھی آپ نے اچھے ڈھنگ سے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ پروین شاکر کی منفرد نسائیہ شاعری دوسری خواتین شاعرہ کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون ایک لہر نئی نئی کافی معیاری ہے۔

ڈاکٹر شباب للت، شملہ : ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ کی ہمت داد طلب ہے کہ اردو زبان کی اس کسمپرسی کے دور میں بھی آپ نے ایک صاف ستھرا ادبی جریدہ شائقین ادب کے لئے نکالنا شروع کیا ہے۔ دربھنگا کی ادبی دین اور علمی خدمات کو بھی منظر عام پر لانے کا مستحسن اقدام لائق ستائش ہے۔ اپنے وطن عزیز کے ماضی و حال کے خادمانِ فن اور تخلیق کاروں کی جو تفاصیل آپ نے فراہم کی ہیں، تاریخ ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ اس اعترافِ خدمات میں پروفیسر عبدالمنان طرزی صاحب کی منظوم ادبی تاریخ خصوصی مقام رکھتی ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق صاحب کا عالمانہ مقالہ ''ایک لہر نئی نئی'' آپ کا پروین شاکر کی نسائیہ شاعری پر مضمون اس میں خاصے کی چیز ہیں۔ اقبال انصاری کا افسانہ اچھا ہے اگرچہ اس کا عنوان کچھ جچا نہیں۔ تجریدی افسانے تو میری تفہیم سے بالا کی چیز ہیں\ شعری حصہ وقیع ہے۔ ہاں ایک بات خدا لگتی کہوں، میرے نام سے جس شعر کا آپ نے حوالہ دیا ہے، وہ شعر دراصل میرا نہیں آپ کے ذہن میں شاید اسی شعر سے ملتے جلتے شاید کسی اور شعر کی وجہ سے یہ تاثر ابھرا ہوگا کہ مذکورہ شعر میری تخلیق ہے، کیونکہ میں نے بھی اس موضوع پر اشعار کہے ہیں، جو رسائل اور میرے شعری مجموعوں میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر ہری ونش ترون، سمستی پور : آپ کا ''تمثیل نو'' ملا۔ سرسری طور سے ایک بار دیکھ گیا۔ بڑا ہی پیارا اور خوبصورت شمارہ ہے یہ۔ آپ کی ایڈیٹنگ کی داد دینا پڑتی ہے۔ ہر طرح کی رنگ اور خوشبو سے اس کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ نظمیں، غزلیں، رباعیات، مضمون، کہانیاں، قطعات، ادبی ہلچل، تبصرہ بھی اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں۔ آپ کا اڈیٹوریل سچ مچ کچھ کہہ جاتا ہے۔ آپ کے اس رسالہ اور آپ کی ایڈیٹنگ مہارت کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہی ہوگا۔ خدا آپ کو اور آپ کے قلم کو سلامت رکھے۔ یہی میری دعاء ہے۔

قیصر تمکین کمبران، انگلستان: ''تمثیل نو'' کا دوسرا شمارہ آج ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ میرے لئے یہ دوسرا شمارہ ہی پہلے کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کے اجرا پر مبارکباد پیش کر رہا ہوں۔ خدا کرے آپ اسے جاری رکھنے میں کامیاب ہوں۔ اصل میں جب کوئی ''اردو دیوانہ''

اس طرح کی وادئ پر خار میں قدم رکھتا ہے تو میں اس کے شوق شہادت کا دل وجان سے قائل ہو جاتا ہوں۔ اردو رسالہ اور وہ بھی ہندوستان میں نکالنے کا سودا ہی غالباً شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی'' کی تفسیر ہے۔ میں نے حسب عادت غزلیں چھوڑ کر ہر چیز غور سے پڑھی دو تین باتیں تو بہت نمایاں نظر آئیں۔ اول یہ کہ تمام قلمی معاونین اردو زبان وادب کے حقیقی اور مخلص خیر خواہ ہیں کیونکہ نگارشات میں بے ربطگی، ٹوٹی پھوٹی عبارت آرائی، غلط املا اور ضعف اظہار وغیرہ کی نشانیاں مفقود ہیں۔ کوتاہیاں بعض حلقوں میں طرہ امتیاز بن چکی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تقریباً تمام قلمکار ایک سلجھے ہوئے نقطۂ نظر اور احترام ادب کے قائل نظر آتے ہیں چنانچہ لفنگی تنقید (Punk Criticism) کے دبستان کی کوئی پرچھائیں بھی نہیں ہے۔ تیسری سب سے بڑی بات یہ کہ مدیر کی خوش انتظامی، حسن ترتیب اور ذوق ادب کا احساس ہر صفحے پر ہوتا ہے۔

ارشد اقبال آرش: ''کوہسار جرنل'' میں ''تمثیل نو'' کا اشتہار نظر سے گذرا۔ سوچا قلمی تعاون کے ساتھ آپ کی بزم میں شمولیت کا اعزاز حاصل کرلوں۔

شمس فریدی، جمشید پور: ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ موصول ہو گیا آپ کی محنت اور کاوش قابل قدر ہے۔ بزرگوار پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی کی در بھنگا کی منظوم ادبی تاریخ اور حواشی سے دربھنگہ کی ادبی تاریخ کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

''تمثیل نو'' کے پچھلے شمارہ (جون تا اگست) میں پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن کا مضمون ''سانحۂ بابری مسجد اور منصور عمر'' پڑھ کر میں حیران و پریشان ہو گیا ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فیض آباد سے ۷ کیلومیٹر شمال مشرق میں دریائے گھاگرا (سرجو) کے کنارے اور مغل سرائے سے ۲۰ کیلو میٹر شمال اتر پچھم اور لکھنؤ سے ۱۳۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر حضرت شیثؑ اور حضرت ایوبؑ کے مزارات موجود ہیں۔ میری حیرانی اس لئے بڑھ گئی کہ یہ اطلاع یا معلومات انہیں کن ذرائع سے ہوگی؟ جبکہ حضرت ایوبؑ کا مقبرہ سلطنۃ عمان کے ایک قبائلی علاقہ (جواب ایک خوبصورت شہر بن چکا ہے) سلالہ کے قریب ایک پہاڑی پر موجود ہے۔ وہاں ایک جھرنا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس جھرنے کے پانی سے حضرت ایوبؑ نے غسل کیا تھا۔ آج بھی زائرین وہاں نہاتے ہیں، لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جھرنے کا پانی جلدی امراض سے شفا بخشتا ہے۔ یہ تو ہے آنکھوں دیکھا حال جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، تقریباً ۲۳ سال میں عمان میں رہ چکا ہوں۔ رہی بات حضرت شیثؑ کے مزار کی تو واللہ عالم بالصواب!

(نوٹ: اس ضمن میں پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن صاحب کا جواب اس شمارہ میں شامل ہے۔ادارہ)

اندر سنگھ ورما، گرگاؤں، ہریانہ: ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ جہاں تک مشمولات کا تعلق ہے، وہ واقعی قابل تعریف ہیں۔ مضمون پروین شاکر کی نسائیہ شاعری، ادبی حیثیت کا حامل ہے اور بہت خوب ہے خاص کر شاعرہ کے نسوانی جذبات کے اظہار کے لحاظ سے۔ اقبال انصاری کی کہانی دو سال ہے تو ایک کہانی لیکن دہلی کی مضافاتی کالونیوں میں رونما ہونے والی ایک حقیقت بھی ہے۔ ایسا ہوتا ہے اور ہوا بھی ہے۔ دہلی میں کیا کچھ نہیں ہوتا؟

پروفیسر علیم اللہ حالی، گیا: ''تمثیل نو'' کا شمارہ تین مل گیا۔ شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ آپ کے رسالے میں ترتیب کا حسن نمایاں ہے۔ دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ اپنی طوالت کے باوجود ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جیسے جیسے وقت گذرتا جائے گا اس کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔ پروین شاکر کی شاعری پر آپ کا مقالہ مختصر سہی مگر اچھا ہے۔ آپ نے ان کے بہت سے اچھے اشعار سے کام نکالا ہے۔ اقبال انصاری کا افسانہ ''دو سال'' بھی پڑھا۔ ان کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھ چکا ہوں اس لئے توقع رہتی ہے کہ وہ اسی معیار کی تخلیقات پیش کرینگے۔ ابواللیث جاوید کا افسانہ ''تیسری سمت کا سفر'' علائم کے دلفریب نگار خانے سے جلوہ گری کرتا ہے اور قاری یافت اور نایافت کے جذبے سے ہمکنار ہوتا رہتا ہے۔

سید احمد شمیم، جمشید پور: ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ ہر قدم آگے ہے آپ کی حوصلہ مندیوں اور صلاحیتوں کی شاہد۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی نے دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ لکھ کر بلاشبہ تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اتنے لوگوں کا منظوم تذکرہ آسان نہیں ہے۔

منظور عثمانی، دہلی: ''تمثیل نو'' کا تیسرا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ممنون ہوں کہ آپ نے یاد رکھا۔ ورنہ ''اس دور خودروی میں کسے یاد آئے کون؟'' انشاء اللہ اپنے مضامین کے ذریعہ آپ کی سجائی ہوئی محفل میں شامل ہوتا رہوں گا۔ مظہر امام، ابوالکلام قاسمی اور سعود عالم وغیرہ کا منظوم تعارف بیحد پسند آیا۔ دربھنگا کی چند معروف ہستیوں سے واقف تو تھا لیکن یہ جان کر کہ اس سرزمین کو اتنے کثیر فنکاروں کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے حیرت اور خوشی ہوئی۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، مظفر پور: ''تمثیل نو'' کا تیسرا شمارہ ملا۔ تمام مشتملات توجہ طلب ہیں۔ پروین شاکر سے متعلق آپ کا مضمون اور ڈاکٹر مناظر عاشق صاحب کا ''ایک لہرئی

نئی ۔۳'' شعروادب کے نئے امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پروفیسر ظرزی صاحب کا مجاہدہ بھی خوب ہے۔ دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ نویسی کی یہ روایت یادرکھی جائے گی۔ غزلیں اور تضمین بھی، سخن طرازی کی اچھی مثالیں ہیں۔ خدا کرے تمثیل نو اور بہتر نقش قائم کرے۔

پروفیسر ناز قادری، مظفر پور: ''تمثیل نو'' کے دوشمارے ابواللیث جاوید کے توسط سے موصول ہوئے۔ میں ادب کا ایک خاموش طالب علم ہوں' مکتوباتی ادیب بھی نہیں کہ فوراً تاثرات لکھ بھیجوں اور پھر مکتوبات کے حصے میں تعریف وتوصیف کے یکساں رنگ سے طبیعت بیزار ہوجاتی ہے۔ مشمولات کا غیر جانبدارانہ مطالعہ وتجزیہ تحریر ہوتو ذہن کو روشنی ملتی ہے۔ آپ جس ادبی حلقے سے تعلق رکھتے ہیں ''تمثیل نو'' میں نکھار اور معیار پیدا ہونا فطری ہے۔ میں آپ کے تخلیقی سفر سے بخوبی واقف ہوں اور اب صحافتی رنگ بھی پیش نظر ہے۔ آپ سے صحت مند ادب کی خدمت متوقع ہے۔ آپ نے مجھے یاد رکھا، میرے لئے بڑی بات ہے......

حباب ہاشمی، الہ آباد: ''تمثیل نو'' کا تیسرا شمارہ موصول ہوا۔ ''دربھنگہ کی منظوم ادبی تاریخ'' کا قسط وار سلسلہ اہمیت وافادیت کا حامل ہے۔ درجنوں مشاہیر ادب کا تعلق دربھنگہ جیسی مردم خیز زمین سے ہے جنہیں میں جانتا ہوں۔ حواشی بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کئے گئے ہیں۔ پروفیسر طرزی کو اس کاوش کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ پروین شاکر کی نسائیہ شاعری اختصار کے باوصف قابل قدر ہے۔

ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی، مظفر پور: ''تمثیل نو'' کا شمارہ ملا۔ بڑے سلیقے سے گلہائے رنگ رنگ سے آپ نے اسے سجایا ہے۔ یوں تو اس شمارہ کے سارے مضامین ومشتملات بحیثیت مجموعی ٹھیک ہی ہیں لیکن مجھے ''دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ'' نے خاصا متاثر کیا ہے۔

نارنگ ساقی، نئی دھلی: ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ رباعیات میں ساحر شیوی اور اکمل یزدانی جامعی کا ''کھگڑا میلہ مشاعرہ'' پسند آئے۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی کی نظم دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ نہایت دلچسپ ہے اور حواشی کی وجہ سے آنے والی نسلوں کیلئے تحقیق میں بھی معاون ہوگی۔ اقبال انصاری ہمارے بہت سلجھے ہوئے اور کہنہ مشق ادیب ہیں اگر وہ اپنی کہانی ''دوسال'' کا اختتام ذرا بہتر طریقے سے کرتے تو کہانی اور بھی خوبصورت ہوتی۔ تبصرہ بھی جاندار ہے۔ دعاء ہے کہ تمثیل نو دن بہ دن اور نکھرتا جائے۔

راشد جمال فاروقی، دھرادون: ''تمثیل نو'' شمارہ ۳ موصول ہوا تھا۔ ابھی جستہ جستہ دیکھ سکا ہوں۔ آپ لوگ صرف نام کے نہیں ہر طرح سے عظیم اور اعظم ہیں کہ ادب کی خدمت میں لگے ہیں۔ دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ بڑا معرکہ کا کام ہے۔ اسے بار بار پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ شعری حصہ بھاری بھر کم ہے اور تمام بڑے ناموں سے مزین بھی۔ پروین شاکر میری بھی پسندیدہ شاعرہ ہیں آپ نے اپنے مقالے کو کافی پر مغز بنا دیا ہے۔

سید اختر الاسلام، میرٹھ: ''تمثیل نو'' شمارہ ۳ موصول ہوا۔ دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ کا جواب نہیں۔ نذیر فتح پوری نے کوشش کی ہے کہ ہر ریاست کے ادباء شعراء اہل قلم اور دانشوروں کا احاطہ ایک مضمون میں کرائیں تاکہ مختلف ریاستوں کی عصری اور عہد ماضی کے اہل قلم پر قابل قدر مواد فراہم ہو جائے مگر منظوم ادبی تاریخ کی جو نہج پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ نے ڈالی ہے وہ ایک دم نئی ہے اور ان ادبی ناموں کے جو حواشی تحریر کئے گئے ہیں ان سے دربھنگا کی ادبی تاریخ کو جلا ملتی ہے۔ پروین شاکر پر آپ کا مضمون بہت پسند آیا۔

نعمان شوق، دھلی: ''تمثیل نو'' کے تمام شمارے ملے۔ ممنونیت کے اس احساس کو لفظوں میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ بس ذرا تخلیقات کے انتخاب میں سختی برتیئے اس سے ادب کے شہدے، ہو سکتا ہے آپ سے ناراض ہوں لیکن اس کی پروا نہ کیجئے۔

آشا شیلی، ھماچل پردیش: ''تمثیل نو'' کا تیسرا شمارہ موصول ہوا۔ پروین شاکر کے بارے میں کچھ جان لینا میری دیرینہ خواہش تھی جو تمثیل نو نے پوری کی۔ آپ نے چن چن کر غزل پاروں سے شمارہ کی خوبصورتی کو چار چاند لگائے ہیں۔ آپ نے میرا نام آشا شبلی شائع کیا ہے جو غلط ہے میرا نام آشا شیلیؔ ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ نھال، شعبۂ حیوانیات' ال ان ایم یو۔ دربھنگا: ''تمثیل نو'' کا تیسرا شمارہ ملا۔ پہلے دو شمارے بھی موصول ہوئے تھے۔ ایک مثل مشہور ہے۔ ''پہلا'' واقعہ ''دوسرا'' اتفاق مگر ''تیسرا'' حقیقت ہوتا ہے۔ بھئی آپ نے تو واقعی اپنی صلاحیتوں اور کاوشوں کو بڑا خوبصورت رنگ دے دیا ہے۔ تمام مشمولات اچھے ہیں اور ''دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ'' تو ایک تاریخی تخلیق ہے جو جریدہ کے اوراق پر اپنی مثال آپ ہے۔ اور ہاں! ایک حقیر سا مشورہ بھی دینا چاہتا ہوں۔ بحثیت سہ ماہی کے اگر ہر شمارہ ایک خاص نمبر ہوا کرے تو بس چار چاند لگ جائے۔ یہ بات ایک

Journal کو Reference Journal بنادیتی ہے۔ میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

ھلال غزالی، دمام (سعودی عربیہ): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ بقائے اردو کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی فہرست میں اپنے دوست ڈاکٹر امام اعظم کا نام دیکھ کر اور پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ پرچہ اچھا اور معیاری ہے۔ اداریہ پسند آیا۔ ڈاکٹر منان طرزی کی منظوم تاریخ دربھنگہ والوں کے لئے ایک لاجواب تحفہ اور تاریخی کاوش ہے۔

سلطان احمد، ایم۔ایل۔اے۔(راجد) دربھنگا: ''تمثیل نو'' کا ہر شمارہ اپنے وقت پر ملتا رہا ہے' یاد آوری کے لئے شکریہ۔ جناب پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی نے ''تمثیل نو'' کے شمارہ ۲ میں ''یادرفتگاں'' کے طور پر اسلاف کی یاد تازہ کردی' شمارہ ۳ ذکر قائماں میں موجودہ ارباب حل و عقد کو زندہ و پائندہ کردیا۔ یہ تحریک تمثیل نو کی دین ہے...... ورنہ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں۔ جو آج دو سو سال قبل سے ابتک کی ادبی داستانوں اور اپنے اسلاف کے قابل فخر کارناموں سے واقف ہیں۔ طرزی صاحب نے ادبی دنیا کے قلم کاروں کی تخلیقوں' مشاہیر دربھنگا کے کارناموں اور متوسلین دربھنگا کی سرگرمیوں کا ذکر تو کیا ہے لیکن ایک گوشہ اہل سیاست کا بالکل ہی فراموش کر گئے ہیں۔ کیا ہم اور ہماری قوم سیاسی اعتبار سے بالکل ہی اس لائق نہیں کہ اسے بھی آپ ادبی دنیا سے روشناس کراسکیں۔ آپ ایسی شخصیات میں جناب خان بہادر عبدالجلیل ایڈوکیٹ سابق ایم۔ایل۔اے' معروف صحافی مولوی عبدالسمیع ندوی سابق وزیر کابینہ' مولوی عبدالشکور سابق ڈپٹی اسپیکر بہار قانون ساز' پروفیسر کلیم احمد ایم۔ایل۔اے وغیرہ حی القائم میں جناب فدا حسین انصاری ایم۔ایل۔سی' پروفیسر اشفاق انصاری سابق وزیر بہار' علی اشرف فاطمی سابق ایم۔پی' عبدالباری صدیقی وزیر کابینہ، جناب نیر اعظم ایم۔ایل۔اے وغیرہ۔ ڈاکٹر طرزی نے اگر جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے تو یہ مقام افسوس ہے اگر سہواً ایسا ہوا ہے تو اس کی تلافی کے لئے ''تمثیل نو'' میں آپ سے عرض ہے کہ ''باقیات الصالحات'' کا عنوان دے کر آئندہ شماروں میں ان جیسے اور بھی بہت سے افراد یا شخصیات مرحومین تا حی القائم جو چھوٹ گئے ہیں ان کے متعلق بھی ان کی حکارگذاریوں پر اشعار و تعلیقات رقم فرما کر ادبی دیانتداری کا ثبوت فراہم کریں......''

(نوٹ: اس ضمن میں پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی صاحب کی وضاحت ملاحظہ فرمائیں۔ ادارہ)

پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی، دربھنگا: عزیزی ڈاکٹر امام اعظم! اسلام علیکم،

عزیز گرامی قدر بابو سلطان احمد، موجودہ ایم۔ ایل۔ اے۔ دربھنگہ کے مکتوب (بنام ایڈیٹر تمثیل نو) کی نقل مجھ کو بھیج کر، جس میں ''رفتگاں و قائماں'' سے متعلق ایک اہم اٹھائے گئے سوال کی طرف ایم۔ ایل۔ اے موصوف نے توجہ دلائی ہے، آپ نے مجھ سے وضاحت طلب کی ہے۔

بنیادی طور پر یہ ادبی تذکرہ ہے۔ اس میں ایسے ادباء، شعراء، ناقدین، ناول نگاران، افسانہ نویساں انشائیہ نگاران صحافیان اور صاحب تصانیف علماء کا ذکر ہے جو قدیم دربھنگہ کے باشندے تھے یا ہیں پھر ایسے ۳۳ (رفتگاں و قائماں) کا ذکر ہے جو دربھنگہ کے باشندے تو نہیں تھے لیکن دربھنگہ ان کا مستقر تھا یا ہے، انہیں متوسلین کے خانے میں رکھا گیا ہے۔ اسی طرح کچھ (۲۵) مشاہیر (رفتگاں و قائماں) کے تحت آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مشاہیر بھی ''کچھ'' ہی ہیں سب نہیں ہیں۔

اگر دربھنگہ ضلع کا مختلف طبقاتی جہتوں سے تذکرہ لکھا جائے تو یہ کام ایسی کئی جلدوں پر انجام پذیر ہوگا۔ تذکرہ مسلم وکلائے دربھنگہ، تذکرہ مسلم سیاستداں دربھنگہ، تذکرہ مسلم قائدین و عمائدین دربھنگہ، تذکرہ مسلم مجاہدین آزادی (دربھنگہ) تذکرہ بزرگان و مخدومانِ دربھنگہ اور تذکرہ مسلم شرفاء و نجبائے دربھنگہ جیسی الگ الگ تصنیف ہو سکتی ہے۔ میں نے سیاستدانوں کا ذکر نہیں کیا ہے صرف ایک نام اس خانے کا شفیع صاحب مرحوم کا آیا ہے مگر وجہ ان کی علم دوستی تھی سیاستدانوں کو نظر انداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اتنا بڑا پروجیکٹ کسی ایک آدمی اور ایک قلم کے بل بوتے کا نہیں ہے ایم۔ ایل۔ اے موصوف نے ایک اہم مسئلے کی طرف انگلی اٹھائی ہے۔ اس سلسلے میں اپنی خدمات تو میں پیش کر سکتا ہوں لیکن میری بھی کچھ مجبوریاں اور ضرورتیں میرا دامن پکڑتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صاحبانِ علم و فن اور سرمایہ داران شہر دونوں اپنے اسلاف کے زریں کارناموں کو محفوظ کر لینے کا ارادہ اور عزم دکھلائیں۔ ورنہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

آگ کو کس نے نہ گلزار بنانا چاہا　　جل بجھے کتنے آگ گلستاں نہ بنی

اردو کے ایسے قارئین کی تعداد کہ کتاب خرید کر مصنف کی حوصلہ افزائی فرمائیں، مایوس کن ہے۔ ابھی میں ایک کتاب کی طباعت کے صرفہ کثیر سے جاں بر نہیں ہو سکا ہوں کوئی دوسرا بڑا کام کرنے کی طاقت کہاں۔ ہم سے جو ہو سکا، وہ کر گذرے　　اب ترا امتحان ہے پیارے

(وضاحت گذار۔ طرزی)

R. NO: 21523/22/AL/TC/88 Rs. 15/-
Quarterly TAMSEEL-E-NAU January - March 2002
Vol. : 1, Issue : 4 Ph : 06272-35117
Editor : Dr. IMAM AZAM
Qilaghat, Darbhanga-846004 (Bihar)